قرآن کا قانون
عروج و زوال

امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد

قرآن
کا
قانونِ عروج و زوال

مولانا ابوالکلام آزاد

ناشر

شاہین بک سینٹر ۹/۵۵۳۹

370

پرانا سیلم پور دہلی ۱۱۰۰۳۱

بار اول — اکتوبر سنہ ۱۹۸۴ء

باہتمام — محمد اقبال

ناشر۔ شاہین بک سینٹر ۹/۵۵۳۹ پٹھانا سیلم پور دہلی ۳۱

نیو پبلک پریس۔ دہلی

سول ایجنٹ برائے کشمیر

شیخ محمد عثمان اینڈ سنز تاجران کتب
گاؤکدل چوک۔ ایکس چینج روڈ سرینگر

فہرست

اُمّتِ مسلمہ

تاسیس اور نشاۃِ ثانیہ

اہلِ عرب نے اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مجموعۂ تعلیم و ہدایت کو بالکل بھلا دیا تھا۔ لیکن انہوں نے خانہ کعبہ کے کنگرے پر چڑھ کر تمام دنیا کو جو دعوتِ عام دی تھی اس کی صدائے بازگشت اب تک عرب کے در و دیوار سے آ رہی تھی۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝

اور جب ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے ایک معبد قرار

دیا اور حکم دیا کہ ہماری جبروت میں اور کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرانا۔ اور اس گھر کو طواف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے ہمیشہ پاک و مقدس رکھنا نیز ہم نے حکم دیا کہ دنیا میں حج کی پکار بلند کرو، لوگ تمہاری طرف دوڑتے چلے آئیں گے۔ ان میں وہ پاپیادہ بھی ہوں گے اور وہ بھی جنہوں نے مختلف قسم کی سواریوں پر دور دراز مقامات سے قطع مسافت کی ہوگی۔

لیکن حج کے ساتھ جب جھوٹ مل جاتا ہے تو وہ اور بھی خطرناک ہو جاتا ہے۔ اہل عرب نے اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس سنت قدیمہ کو اب تک زندہ رکھا تھا لیکن بدعات و اختراعات کی آمیزش نے اصل حقیقت کو بالکل گم کر دیا تھا۔ خدا نے اپنے گھر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قیام کی اجازت صرف اس شرط پر دی تھی کہ کسی کو خدا کا شریک نہ بنانا۔

لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا

لیکن اب خدا کا یہ گھر تین سو ساٹھ بتوں کا مرکز بن گیا تھا اور ان کا طواف کیا جاتا تھا۔

خدا نے حج کا مقصد یہ قرار دیا تھا کہ دنیوی فوائد کے ساتھ خدا کا ذکر قائم کیا جائے۔ لیکن اب صرف آباو اجداد کے کارنامے، فخر و غرور کے ترانے گائے جاتے تھے

حج کا ایک مقصد تمام انسانوں میں مساوات قائم کرنا تھا اس لئے تمام عرب بلکہ تمام دنیا کو اس کی دعوت عام دی گئی۔ اور سب کو وضع و لباس میں متحد کر دیا گیا۔

لیکن قریش کے غرور فضیلت نے اپنے لئے بعض خاص امتیازات قائم کر لئے تھے۔ جو اصول مساوات کے بالکل منافی تھے۔ مثلاً تمام عرب عرفات کے میدان

میں قیام کرتے تھے لیکن قریش مزدلفہ سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ ہم متولیان حرم حرم کے باہر نہیں جا سکتے جس طرح آج کل کے امرا نظم و نسق و والیان ریاست عام مسلمانوں کے ساتھ مسجد میں آکر بیٹھنے اور دوش بدوش کھڑے ہونے میں اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ قریش کے سوا عرب کے تمام مرد و زن برہنہ طواف کرتے تھے۔ ستر عورت کے ساتھ صرف وہی لوگ طواف کر سکتے جن کو قریش کی طرف سے کپڑا ملتا اور قریش نے اس کو بھی اپنی اظہار سیادت کا ایک ذریعہ بنا لیا تھا۔

عمرہ گویا حج کا ایک مقدمہ یا جز تھا۔ لیکن اہل عرب ایام حج میں عمرہ کو سخت گناہ سمجھتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ جب حاجیوں کی سواریوں کے پشت کے زخم اچھے ہو جائیں اور صفر کا مہینہ گزر جائے تب عمرہ جائز ہو سکتا ہے۔

حج کے تمام ارکان و اجزا میں یہودیانہ رہبانیت کا عالمگیر مرض ساری ہو گیا تھا اپنے گھر سے پا پیادہ حج کرنے کی منت ماننا۔ جب تک حج ادا نہ ہو جائے خاموش رہنا۔ قربانی کے اونٹوں پر کسی حالت میں سوار نہ ہونا، ناک میں نکیل ڈال کر جانوروں کی طرح خانہ کعبہ کا طواف کرنا، زمانہ حج میں گھر کے اندر دروازے کی راہ سے نہ گھسنا بلکہ پچھواڑے کی طرف سے دیوار پھاند کر آنا۔ در و دیوار پر قربانی کے جانوروں کے خون کا چھاپہ لگانا عرب کا عام شعار ہو گیا تھا۔

اسلام کا ظہور درحقیقت دین ابراہیمی کی حقیقت کی تکمیل تھی۔ اس لئے وہ ابتدا ہی سے اس حقیقت گم شدہ کی تجدید و احیا میں مصروف ہو گیا۔ جس کا قالب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مبارک ہاتھوں نے تیار کیا تھا۔ اسلام کا مجموعہ

عقائد و عبادات صرف توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج سے مرکب ہے۔ لیکن ان تمام ارکان میں حج ہی ایک ایسا رکن ہے جس سے اس تمام مجموعہ کی ہیئت ترکیبی مکمل ہوتی ہے۔ اور یہ تمام ارکان اس کے اندر جمع ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کو صرف خانہ کعبہ ہی کے ساتھ متعلق کر دیا۔

إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هَٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِي حَرَّمَهَا وَلَهُ كُلُّ شَيْءٍ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝

مجھ کو صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر (مکہ) کے خدا کی عبادت کروں جس نے اس کو عزت دی۔ سب کچھ اسی خدا کا ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اسی کا فرمانبردار مسلم ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے ہر موقع پر حج کے ساتھ اسلام کا ذکر بطور لازم و ملزوم کے کیا۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ ط

اور ہر ایک امت کے لئے ہم نے قربانی قرار دی تھی۔ تاکہ خدا نے ان کو جو چوپائے بخشے ہیں ان کی قربانی کے وقت خدا کا نام لیں۔ پس تم سب کا خدا ایک ہے اس کے تم سب فرماں بردار بن جاؤ اور خدا کے خاکسار بندوں کو حج کے ذریعے دین حق کی بشارت دو۔

اسلام خدا کا ایک فطری معاہدہ تھا۔ جس کو انسان کی ظالمانہ عہد شکنی نے بالکل چاک چاک کر دیا تھا۔ اس لئے خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ناخلف

اولاد کو روزِ اول ہی اس کے ثمرات سے محروم کر دیا۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ○

جب خدا نے چند احکام کے ذریعے ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا اور وہ خدا کے امتحان میں پورے اترے تو خدا نے کہا کہ اب میں تمہیں دنیا کی امامت عطا کرتا ہوں۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا اور میری اولاد کو بھی؟ ارشاد ہوا کہ ہاں، مگر اس قول و قرار میں ظالم لوگ داخل نہیں ہو سکتے۔

خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جن کلمات کے ذریعے آزمایا اور جن کی بنا پر انہیں دنیا کی امامت عطا ہوئی وہ اسلام کے اجزار اولین۔ توحید الہی، قربانی نفس و جذبات، صلوات الہی کا قیام اور معرفت دین فطری کے امتحانات تھے۔

اگرچہ ان کی اولاد میں سے چند ناخلف لوگوں نے ان ارکان کو چھوڑ کر اپنے اوپر ظلم کیا۔ اور اس موروثی عہد سے محروم ہو گئے۔

قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ

لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات کے اندر ایک دوسری امت بھی چھپی ہوئی تھی۔ جس کے لئے خود انہوں نے خدا سے دعا کی تھی۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا حضرت ابراہیم علیہ السلام گو بظاہر ایک فردِ واحد تھے۔ مگر ان کی فعالیت روحانیہ والہیہ کے اندر ایک پوری قوم قانت و مسلم پوشیدہ تھی۔

اب اس امت مسلمہ کے ظہور کا وقت آگیا اور وہ رسولِ ہدی موعود غار حرا کے تاریک گوشوں سے نکل کر منظرِ عام پر نمودار ہوا تاکہ اس نے نمود اس

اندھیرے میں جو روشنی دیکھی ہے وہ روشنی تمام دنیا کو بھی دکھلا دے۔

یُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ لَقَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ ۝

وہ پیغمبر اُن کو اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ بیشک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور ہدایت اور ایک کھلی کھلی ہدایتیں دینے والی کتاب آئی۔

وہ منظرِ عام پر آیا تو سب سے پہلے اپنے باپ کے موروثی گھر کو ظالموں کے ہاتھ سے واپس لینا چاہا۔ لیکن اس کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی طرح بتدریج چند روحانی مراحل سے گزرنا ضرور تھا۔ چنانچہ اسؐ نے ان مرحلوں سے بتدریج گزرنا شروع کیا۔ اسؐ نے غارِ حرا سے نکلنے کے ساتھ ہی توحید کا غلغلہ بلند کیا۔ کہ خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جو عہد لیا تھا اس کی پہلی شرط یہی تھی۔ اَنْ لَا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا ۝ پھر اس نے صفِ نماز قائم کی کہ یہ گھر صرف خدا ہی کے آگے سر جھکانے والوں کے لئے بنایا گیا تھا۔ وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ اسؐ نے روزے کی تعلیم دی کہ وہ شرط الحج کا جامع و مکمل تھا۔

فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۝

جس شخص نے ان مہینوں میں حج کا عزم کر لیا تو اس کو ہر قسم کی نفس پرستی بدکاری اور جھگڑے تکرار سے اجتناب کرنا لازمی ہے۔

اور روزہ کی حقیقت یہی ہے کہ وہ انسان کو غیبت، بہتان، فسق و فجور، مخاصمت، منازعت اور نفس پرستی سے روکتا ہے۔ جیسا کہ احکام صیام میں فرمایا۔

ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ۝

پھر رات تک روزہ پورا کرو۔ اور روزہ کی حالت میں عورتوں کے نزدیک نہ

جاؤ۔ اور اگر مساجد میں اعتکاف کرو تو شب کو بھی ان سے الگ رہو۔ اس نے زکوٰۃ بھی فرض کردی کہ وہ بھی حج کا ایک اہم مقصد تھا۔

فَكُلُوا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيْرَ ط

قربانی کا گوشت خود بھی کھاؤ۔ اور فقیروں اور محتاجوں کو بھی کھلاؤ۔

اس طرح جب "امت مسلمہ" کا روحانی خاکہ تیار ہوگیا تو اس نے اپنی طرح ان کو بھی منظر عام پر نمایاں کرنا چاہا۔ اس غرض سے اس نے عمرہ کی تیاری کی اور چودہ پندرہ سو کی جمعیت کے ساتھ روانہ ہوا۔ کہ پہلی بار اپنے آبائی گھر کو حسرت آلود نگاہوں سے دیکھ کر چلے آئیں۔

لیکن یہ کاروانِ ہدایت راستے میں بمقام حدیبیہ روک دیا گیا۔ دوسرے سال حسب شرائط صلح زیارت کعبہ کی اجازت ملی۔ اور آپ مکہ میں قیام کرکے چلے آئے۔ اب اس مصالحت نے راستے کے تمام نشیب و فراز ہموار کردیے تھے صرف خانہ کعبہ میں پتھروں کا ایک ڈھیر رہ گیا تھا۔ اسے بھی فتح مکہ نے صاف کردیا۔

دَخَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَكَّةَ يَوْمَ الْفَتْحِ وَحَوْلَ الْبَيْتِ سِتُّوْنَ وَثَلٰثُ مِائَةِ نُصُبٍ فَجَعَلَ يَطْعَنُهَا بِعُوْدٍ فِيْ يَدِهٖ وَيَقُوْلُ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط

آں حضرت فتح مکہ کے دن جب خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو اس کے گرد تین سو ساٹھ بت نظر آئے۔ آپ ان کو ایک لکڑی کے ذریعے ٹھکراتے جاتے تھے۔ اور یہ آیت پڑھتے جاتے تھے۔ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ط

یعنی حق اپنے مرکز پر آگیا۔ اور باطل نے اس کے سامنے ٹھوکر کھائی۔ باطل پامال ہونے ہی کے قابل تھا۔

اب میدان بالکل صاف تھا۔ راستے میں ایک کنکری بھی سنگ راہ نہیں ہوسکتی تھی۔ باپ نے گھر کو جس حال میں چھوڑا تھا۔ بیٹے نے اسی حالت میں اس پر قبضہ کرلیا۔ تمام عرب نے فتح مکہ کو اسلام و کفر کا معیارِ صداقت قرار دیا۔ جب مکہ فتح ہوا تو لوگ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ وقت آگیا تھا کہ دنیا کو اس جدید النشاۃ امتِ مسلمہ کے قالب روحانی کا منظر عام طور پر دکھایا جاتا۔ اس لئے دوبارہ اسی دعوت نامہ کا اعادہ کیا گیا۔ جس کے ذریعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمام عالم میں ایک غلغلہ عام ڈال دیا تھا۔ مگر اس قوت کا تعلق فعل میں آنا ظہور ہی پر موقوف تھا۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۝

جو لوگ مالی اور جسمانی حالت کے لحاظ سے حج کی استطاعت رکھتے ہیں اُن پر اب حج فرض کردیا گیا۔

اس صدا پر تمام عرب نے لبیک کہا۔ اور آپؐ کے گرد تیرہ چودہ ہزار آدمی جمع ہوگئے۔ عرب نے ارکان حج میں جو بدعات و اختراعات پیدا کر رکھی تھیں۔ ان کو ایک ایک کرکے چھڑا دیا گیا۔

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۝

زمانہ حج میں خدا کو اسی جوش و خروش سے یاد کرو جس طرح اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں کا اعادہ کرتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ سرگرمیوں کے ساتھ قریش کے تمام امتیازات مٹا دیئے گئے اور تمام عرب کے ساتھ ان کو بھی عرفہ کے ایک گوشہ میں کھڑا کردیا گیا۔

ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ

غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○

اور جس جگہ سے لوگ روانہ ہوں، تم بھی وہیں سے روانہ ہوا کرو۔ اور فخر و غرور کی جگہ خدا سے مغفرت مانگو۔ کیونکہ خدا بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے

سب سے بدترین رسم برہنہ طواف کرنے کی تھی۔ اور مردوں سے زیادہ حیا سوز نظارہ عورتوں کے طواف کا ہوتا تھا۔ لیکن ایک سال پہلے ہی سے اس کی عام ممانعت کرادی گئی۔

اَنَّ اَبَا ھُرَیْرَۃَ اَخْبَرَہٗ اَنَّ اَبَا بَکْرِ الصِّدِّیْقَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ بَعَثَہٗ فِی الْحَجَّۃِ الَّتِیْ اَمَّرَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَبْلَ حَجَّۃِ الْوَدَاعِ یَوْمَ النَّحْرِ فِیْ رَھْطٍ یُؤَذِّنُ فِی النَّاسِ اَلَا لَا یَحُجُّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِکٌ وَّلَا یَطُوْفُ بِالْبَیْتِ عُرْیَانٌ ○

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حجۃ الوداع سے پہلے آنحضرت نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ایک حج کا امیر بنایا اور انہوں نے مجھ کو ایک گروہ کے ساتھ روانہ کیا تاکہ اعلان کر دیا جائے کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک یا کوئی برہنہ شخص حج یا طواف نہ کر سکے گا۔

زمانہ حج میں عمرہ کرنے والوں کو فاسق و فاجر کہا جاتا تھا۔ لیکن آنحضرت صلعم نے حجۃ الوداع میں عمرہ ہی کا احرام باندھا۔ اور صحابہ کو بھی عمرہ کرنے کا حکم دیا۔ پا پیادہ اور خاموش حج کرنے کی ممانعت کی گئی۔ قربانی کے جانوروں پر سوار ہونے کا حکم دیا گیا۔ ناک میں رسی ڈال کر طواف کرنے سے روکا گیا۔ گھر میں دروازے سے داخل ہونے کا حکم ہوا۔

لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ گھروں میں پچھواڑے سے آؤ نیکی تو صرف اس کی ہے جس نے پرہیزگاری اختیار کی پس گھروں میں دروازے ہی کی راہ سے آؤ اور خدا سے ڈرو۔ یقین ہے کہ تم کامیاب ہوگے۔

قربانی کی حقیقت واضح کی گئی اور بتایا گیا کہ وہ صرف ایثار نفس و فدویت جان و روح کے اظہار کا ایک طریقہ ہے۔ اس کا گوشت یا خون خدا تک نہیں پہنچتا۔ کہ اس کے چھاپے سے دیواروں کو رنگین کر دیا جائے۔ خدا تو صرف خالص نیتوں اور پاک و صاف دلوں کو دیکھتا ہے۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاۤؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۝

خدا تک قربانی کے جانوروں کا گوشت و خون نہیں پہنچتا بلکہ اس تک صرف تمہاری پرہیزگاری پہنچتی ہے۔

یہ چھلکے اتر گئے تو خالص مغز باقی رہ گیا۔ اب وادی مکہ میں خلوص کے دو قدیم و جدید منظر نمایاں ہو گئے۔ ایک طرف آب زمزم کی شفاف سطح لہریں لے رہی تھی۔ دوسری طرف ایک جدید النشاۃ قوم کا دریائے وحدت موجیں مار رہا تھا۔

لیکن دنیا اب تک اس حقیقت سے بے خبر تھی۔ اسلام کی ۲۳ سالہ زندگی کا مد و جزر تمام عرب دیکھ چکا تھا۔ مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ اسلام کی تاریخی زندگی کن نتائج پر مشتمل تھی۔ اور مسلمانوں کی جد و جہد فدویت ایثار نفس و روح کا مقصد کیا تھا۔ اب اس کی توضیح کا وقت آگیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس گھر کا سنگ بنیاد رکھا تو یہ دعا پڑھی تھی:۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۝

جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا۔ کہ خداوند! اس شہر کو امن کا شہر بنا اور اس کے باشندے اگر خدا اور روز قیامت پر ایمان لائیں تو ان کو ہر قسم ثمرات و نعام عطا فرما۔

جس وقت انہوں نے یہ دعا کی تھی تمام دنیا فتنہ و فساد کا گہوارہ بن رہی تھی۔ دنیا کا امن وامان اٹھ گیا تھا۔ اطمینان و سکون کی نیند آنکھوں سے اڑ گئی تھی۔ دنیا کی عزت و آبرو معرض خطر میں تھی، جان و مال کا تحفظ ناممکن ہو گیا تھا۔ کمزور اور ضعیف لوگوں کے حقوق پامال کر دیئے گئے تھے۔ عدالت کا گھر ویران، حریت انسانیت مفقود۔ اور نیکی کی مظلومیت انتہائی حد تک پہنچ چکی تھی۔ کرہ ارض کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جو ظلم و کفر کی تاریکی سے ظلمت کدہ نہ ہو۔

اس لئے انہوں نے آباد دنیا کے ناپاک حصوں سے کنارہ کش ہو کر ایک وادی غیر ذی زرع میں سکونت اختیار کی۔ وہاں ایک دارالامن بنایا۔ اور تمام دنیا کو صلح و سلام کی دعوت عام دی۔ اب ان کی صالح اولاد سے یہ دارالامن بھی چھین لیا گیا تھا۔ اس لئے اس کی واپسی کے پورے دس سال تک اس کے فرزند نے بھی باپ کی طرح میدان میں ڈیرہ ڈال دیا۔ فتح مکہ نے جب اس کا مامن و ملجا واپس دلایا تو وہ اس میں داخل ہوا۔ کہ باپ کی طرح تمام دنیا کو گم شدہ حق کی واپسی کی بشارت دے۔ چنانچہ وہ اونٹ پر سوار ہو کر نکلا۔ اور تمام دنیا کو مژدہ امن و امان سنایا۔

إِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا فِي شَهْرِكُمْ
هٰذَا فِي بَلَدِكُمْ هٰذَا أَلَا إِنَّ كُلَّ شَيْءٍ مِنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ
تَحْتَ قَدَمَيَّ مَوْضُوعٌ وَأَوَّلُ دَمٍ أَضَعُهُ دِمَاءُ نَا دَمُ ابْنِ رَبِيعَةَ
بِالْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوعٌ وَأَوَّلُ دَمٍ أَضَعُهُ دِمَاءُ نَا دَمُ بْنِ
عَبْدِ الْمُطَّلِبِ. اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ. اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ

جس طرح تم آج کے دن کی۔ اس مہینہ کی۔ اس شہر مقدس میں حرمت کرتے ہو اسی طرح تمہارا خون اور تمہارا مال بھی تم پر حرام ہے۔ اچھی طرح سن لو کہ جاہلیت کی تمام بری رسموں کو آج میں اپنے دونوں قدموں سے کچل ڈالتا ہوں۔ بالخصوص زمانہ جاہلیت کے انتقام اور خون بہا لینے کی رسم تو بالکل مٹا دی جاتی ہے۔ میں سب سے پہلے اپنے بھائی ربیعہ کے انتقام سے دست بردار ہوتا ہوں۔ جاہلیت کی سود خواری کا طریقہ بھی مٹا دیا جاتا ہے اور سب سے پہلے خود میں اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کے سود کو چھوڑتا ہوں۔ خدایا تو گواہ رہیو! خدایا تو گواہ رہیو! خدایا تو گواہ رہیو!! کہ میں نے تیرا پیغام تیرے بندوں تک پہنچا دیا۔

اب حق پھر اپنے اصل مرکز پر آگیا۔ اور باپ نے دنیا کی ہدایت وارشاد کے لئے جس نقطہ سے پہلا قدم اٹھایا تھا بیٹے کے روحانی سفر کی وہ آخری منزل ہوئی اور اس نقطہ پر پہنچ کر اسلام کی تکمیل ہو گئی۔ اس لئے وہ کہ اس نے تمام دنیا کو مژدہ امن سنایا تھا۔ آسمانی فرشتہ نے بھی اس کو کامیابی مقصد کی سب سے آخری بشارت دے دی۔

اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ

لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ○

آج کے دن میں نے تمہارے دین کو بالکل مکمل کر دیا اور تم پر اپنے احسانات پورے کر دیئے۔ اور میں نے اسلام کو ایک برگزیدہ دین منتخب کیا۔

لیکن ان تمام چیزوں سے مقدم اور ان تمام ترقیوں کا سنگِ بنیاد ایک خاص "امت مسلمہ" اور حزب اللہ کا پیدا کرنا اور اس کا استحکام و نشوونما تھا۔

حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے حج کا مقصد اولین اسی کو قرار دیا تھا۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَا اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ○

"خدایا ہم کو اپنا فرماں بردار بنا۔ ہماری اولاد میں سے اپنی ایک "امت مسلمہ" پیدا کر اور اگر ہم سے اس فرماں برداری میں لغزش ہو تو اس کو معاف فرما، تو بڑا مہربان اور معاف کرنے والا ہے۔"

لیکن جس قالب میں قومیت کا ڈھانچہ تیار ہوتا ہے اس میں نہایت شدت اور وسعت کے ساتھ عمل کرتی ہیں۔ آب و ہوا اور مذہب۔ آب و ہوا اور جغرافیہ حدود طبعیہ اگرچہ قومیت کے تمام اجزا کو نہایت وسعت کے ساتھ احاطہ کر لیتے ہیں۔ لیکن ان کے حلقۂ اثر میں کوئی دوسری قوم نہیں داخل ہو سکتی۔ یورپ اور ہندوستان کی قدیم قومیت نے صرف ایک محدود حصۂ دنیا میں نشوونما پائی ہے اور آب و ہوا کے اثر نے ان کو دنیا کی تمام قوموں سے بالکل الگ تھلگ کر دیا ہے۔ لیکن مذہب کا حلقۂ اثر نہایت وسیع ہوتا ہے۔ وہ ایک محدود قطعۂ زمین میں اپنا عمل نہیں کرتا۔ بلکہ دنیا کے ہر حصے کو اپنی آغوش میں جگہ دیتا ہے۔ کرۂ آب و ہوا کا طوفان خیز تصادم اپنے ساحل پر

کسی غیر قوم کو آنے نہیں دیتا مگر مذہب کا ابر کرم اپنے سائے میں تمام دنیا کو لے لیتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جس عظیم الشان قوم کا خاکہ تیار کر رہے تھے۔ اس کا مایۂ خمیر صرف مذہب تھا۔ اور اس کی روحانی ترکیب عنصر آب و ہوا کی آمیزش سے بالکل بے نیاز تھی۔ جماعت قائم ہو کر اگرچہ ایک محسوس مادی شکل میں نظر آتی ہے لیکن درحقیقت اس کا نظام ترکیبی بالکل روحانی طریقہ پر مرتب ہوتا ہے جس کو صرف جذبات و خیالات بلکہ عام معنوں میں صرف قوائے داعیہ کا اتحاد و اشتراک ترتیب دیتا ہے۔ اس بنا پر اس قوم کے پیدا ہونے سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک مذہبی رابطۂ اتحاد کے رشتہ کو مستحکم کیا۔

اِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

جب کہ ابراہیم علیہ السلام سے اس کے خدا نے کہا کہ صرف ہماری ہی فرمانبرداری کرو۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ میں مسلم ہوا پروردگار عالم کے لیے۔

وَوَصّٰى بِهَا اِبْرٰهِيْمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

اور پھر اسی طریقۂ اسلامی کی انہوں نے اور یعقوبؑ نے اپنی نسل کو وصیت کی اور کہا خدا نے تمہارے لئے ایک نہایت برگزیدہ دین منتخب کر دیا ہے۔ تم اس پر عمر بھر قائم رہنا اور مرنا تو مسلمان مرنا۔

لیکن جماعت عموماً اپنے مجموعۂ عقائد کو مجسم طور پر دنیا کی فضائے بسیط میں دیکھنا چاہتی ہے اور اس کے ذریعے اپنی قومیت کے قدیم مودت کو تازہ کرتی ہے۔ اس لئے انہوں نے اس جدید النشاۃ قومیت کے ظہور و تکمیل کے لیے

ایک نہایت مقدس اور وسیع آشیانہ تیار کیا۔

اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

جب ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام خانہ کعبہ کی بنیاد ڈال رہے تھے۔ تو یہ دعا ان کی زبانوں پر تھی۔ خدایا ہماری اس خدمت کو قبول کر۔ تو دعاؤں کا سننے والا اور نیتوں کا جاننے والا ہے۔

یہ صرف اینٹ پتھر کا گھر نہ تھا بلکہ ایک روحانی جماعت کے قالب کا آب و گل تھا۔ اس لئے جب وہ تیار ہو گیا تو انہوں نے اس جماعت کے پیدا ہونے کی دعا کی۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ط

اب یہ قوم پیدا ہوگئی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی آخری وصیت کے ذریعے اس روحانی سر رشتہ حیات کو اس کے حوالے کر دیا۔

وَوَصّٰی بِهَآ اِبْرٰھٖمُ بَنِیْهِ وَیَعْقُوْبُ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَكُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ط

اور ابراہیم اور یعقوب علیہما السلام دونوں نے اس روحانی طریقہ نشوؤنما کی اپنے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ خدا نے تمہارے لئے ایک برگزیدہ دین منتخب فرما دیا ہے تم اس پر قائم رہنا۔

اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِیْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ط

اور پھر کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کے سر پر موت آکھڑی ہوئی اور اس آخری وقت میں انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا۔ میرے بعد کس چیز کی پوجا کرو گے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم تیرے اور تیرے مقدس باپ ابراہیم و اسمٰعیل و اسحٰق کے خدائے واحد کی عبادت کریں گے۔ اور ہم اسی کے فرمانبردار بندے ہیں۔

اب اگرچہ یہ جماعت دنیا میں موجود نہ تھی اور اس کے آثار صالحہ کو زمانے نے بے اثر کر دیا تھا۔

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ط

وہ قوم گزر گئی اس نے جو کام کئے اس کے نتائج اس کے لئے تھے اور تم جو کچھ کرو گے اس کے نتائج تمہارے لئے ہوں گے۔ لیکن اس کی تربیت و نشو و نما کا عہد قدیم اب تک دستبرد زمانہ سے بچا ہوا تھا۔ اور اپنے آغوش میں مقدس یادگاروں کا ایک وسیع ذخیرہ رکھتا تھا۔ اس کے اندر اب تک آب زمزم لہریں لے رہا تھا۔ صفا و مروہ کی چوٹی کی گردنیں اب تک بلند تھیں۔ مذبح اسمٰعیل علیہ السلام اب تک ذبیح کے خون سے رنگین تھا۔ حجر اسود اب تک بوسہ گاہِ خلق تھا۔ مشاعر ابراہیم علیہ السلام اب تک قائم تھے۔ عرفات کی حدود میں اب تک کوئی تبدیلی نہیں کی گئی تھی۔ غرضیکہ اس کے اندر خدا کے سوا سب کچھ تھا۔ اور صرف اس کے جمال جہاں آرا کی کمی تھی۔ اس لئے اس کی تجدید و نفخ روح کے لئے ایک مدت کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا سب سے آخری نتیجہ ظاہر ہوا۔ انہوں نے کعبۃ اللہ کی بنیاد رکھتے ہوئے دعا کی تھی۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ط

خدایا ان کے درمیان انہی لوگوں میں سے ایک پیغمبر بھیج کہ وہ ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے۔ اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دے۔ اور ان کے نفوس کا تزکیہ کردے تو بڑا صاحب اختیار و حکمت ہے۔

چنانچہ اس کا ظہور وجود مقدس حضرت رحمۃ اللعالمین و ختم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صورت میں ہوا۔ جو ٹھیک ٹھیک اس دعا کا پیکر ومثل تھا۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ط

وہ خدا جس نے ایک غیر متمدن قوم میں سے اپنا ایک رسول پیدا کیا۔ جو اللہ کی آیات اس کو سناتا ہے، اس کے نفوس کا تزکیہ کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

پس انہوں نے جو قوم پیدا کردی تھی اس کے اندر سے ایک پیغمبر اٹھا اس نے اس گھر میں سب سے پہلے خدا کو ڈھونڈھنا شروع کیا لیکن وہ اینٹ پتھر کے ڈھیر میں بالکل چھپ گیا تھا۔ فتح مکہ نے اس انبار کو ہٹا دیا۔ تو خدا کے نور سے قندیل حرم پھر روشن ہوگئی۔

وہ قوم جس کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی۔ (۳۱) پیغمبر کے فیض صحبت سے بالکل مزکی و تربیت یافتہ ہوگئی تھی۔ اب ایک مرکز پر جمع کرکے اس کے مذہبی جذبات کو صرف جلا دینا باقی تھا۔ چنانچہ اسے خانہ کعبہ کے اندر لاکر کھڑا کردیا گیا۔ اور اس کے مقدس قدیم مذہبی یادگاروں کو پیدو احیاء سے اس کے مذہبی جذبات کو بالکل پختہ و مستحکم کردیا۔

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا

جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا۔

صفا و مروہ خدا کی قائم کی ہوئی یادگاریں ہیں پس جو لوگ حج یا عمرہ کرتے ہیں ان پر ان دونوں کا طواف کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

کبھی ان کو مشعر حرام کی یاد دلائی گئی۔

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ط

جب عرفات سے لوٹو تو مشعر حرام (مزدلفہ) کے نزدیک خدا کی یاد کرو۔

خانۂ کعبہ خود دنیا کی سب سے قدیم یادگار تھی۔ لیکن اس کی ایک ایک یادگار کو نمایاں تر کیا گیا۔

فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ

اس میں بہت سی کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، منجملہ ان کے ایک نشانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے۔

لیکن جو لوگ خدا کی راہ میں ثابت قدم رہے ان کے نقش پا سجدہ گاہِ خلق ہونے کے مستحق تھے۔ اس لئے حکم دیا گیا۔

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى۔

اور ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو اپنا مصلّٰی بنا لو۔

مادی یادگاروں کی زیارت صرف سیر و تفریح کے لئے کی جاتی ہے لیکن روحانی یادگاروں سے صرف دل کی آنکھیں ہی بصیرت حاصل کر سکتی ہیں۔

اس لئے ان کے ادب و احترام کو اتقا و تبصّر کی دلیل قرار دیا گیا۔

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ط

اور جو لوگ خدا کی قائم کی ہوئی یادگاروں کی تعظیم کرتے ہیں تو یہ تعظیم ان کے دلوں کی پرہیزگاری پر دلالت کرتی ہے۔

وَمَن يُعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ عِندَ رَبِّهِ

اور جو شخص خدا کی قرار دی ہوئی قابل ادب چیزوں کا احترام کرتا ہے تو خدا کے نزدیک اس کا نتیجہ اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان مقدس یادگاروں کے روحانی اثر و نفوذ کو دلوں میں جذب کرا دینا چاہتے تھے۔ اس لئے خاص طور پر لوگوں کو ان کی طرف متوجہ فرماتے رہتے تھے۔

هٰذِهٖ مَشَاعِرُ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ ط۔

خوب غور سے دیکھو اور بصیرت حاصل کرو۔ کیونکہ یہ تمہارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگاریں ہیں۔

جب اسلام نے اس جدید النشاۃ قوم کے وجود کی تکمیل کردی اور خانۂ کعبہ کی ان مقدس یادگاروں کی روحانیت نے اس کی قومیت کے شیرازہ کو مستحکم کر دیا تو پھر ملت ابراہیمی کی فراموش کردہ روشنی دکھا دی گئی۔

فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ط

پس ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ کی پیروی کرو جو صرف ایک خدا کے ہو رہے تھے۔

اب تمام عرب نے ایک خط مستقیم کو اپنا مرکز بنالیا۔ اور قدیم خطوط منحنیہ حرف غلط کی طرح مٹا دیئے گئے۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا تو اس کے بعد خدا نے ابراہیم

واسمٰعیل علیہما السلام کا سب سے بڑا احساس پورا ہو گیا۔

اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط

آج میں نے تمہارے اس دین کو کامل کر دیا جس نے تم کو قومیت کے رشتے میں منسلک کر دیا ہے اور اپنے تمام احسانات تم پر پورے کر دیئے اور تمہارے لئے صرف ایک دین اسلام ہی کو منتخب کیا۔

حقیقتِ اسلام

سب سے پہلے اس امر پر غور کرنا چاہیئے کہ اسلام کی وہ کون سی حقیقت تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی پر طاری ہوئی۔ اور جس کو قرآن حکیم نے امت مرحومہ کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا۔

اسلام کا مادہ "سلم" ہے جو باختلاف حرکات مختلف اشکال میں آکر مختلف معنی پیدا کرتا ہے لیکن لغت کہتا ہے کہ "سلم" بفتحتین اور سلام معنی کسی چیز کو سونپ دینے اطاعت و انقیاد اور گردن جھکا دینے کے ہیں۔ اس سے تسلیم بمعنی ..... سونپ دینے اور استسلام (اے انقیاد و اطاعت) آتا ہے اور فی الحقیقت لفظ "اسلام" بھی انہی معنی پر مشتمل ہے "قرآن کریم میں ان معانی" کے شواہد اس کثرت سے ملتے ہیں کہ ایک مختصر مضمون میں سب کا استقصا ممکن نہیں۔ تاہم ایک دو آیتوں پر نظر ڈالئے تو یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے مثلاً احکام طلاق کی آیات میں

ایک موقعہ پر فرمایا۔

وَاِنۡ اَرَدۡتُّمۡ اَنۡ تَسۡتَرۡضِعُوۡۤا اَوۡلَادَكُمۡ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ اِذَا سَلَّمۡتُمۡ مَّاۤ اٰتَيۡتُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ

اگر تم چاہو کہ اپنے بچے کو کسی دایہ سے دودھ پلواؤ تو اس میں بھی تم پر کچھ گناہ نہیں بشرطیکہ دستور کے مطابق ان کی ماؤں کو جو دینا طے کیا تھا وہ ان کے حوالے کردو۔

اس آیت میں "سلّمتم" حوالہ کر دینے کے معنی میں صاف ہے۔ اس طرح بمعنی اطاعت و انقیاد گردن نہادن کے ایک جگہ فرمایا ہے۔

وَلَهٗۤ اَسۡلَمَ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّكَرۡهًا ؕ

اس آسمان و زمین میں کوئی نہیں جو چار و ناچار دین الٰہی کا حکم بردار مطیع و منقاد نہ ہو۔

وَقَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَلٰـكِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا ؕ

اور یہ جو عرب کے دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے تو ان سے کہہ دو کہ تم ابھی ایمان نہیں لائے۔

کیونکہ وہ دل کے اعتقاد کامل کا نام ہے جو تمہیں نصیب نہیں۔ البتہ یوں کہو کہ ہم نے اس دین کو مان لیا ہر شے کی اصل حقیقت وہی ہو سکتی ہے جو اس کے نام کے اندر موجود ہو۔ دین الٰہی کی حقیقت لفظ اسلام کے معنی ہی میں پوشیدہ ہے۔ لفظ اسلام کے معنی اطاعت، انقیاد گردن نہادن، اور کسی چیز کے حوالہ کر دینے کے ہیں پس اسلام کی حقیقت بھی یہی ہے کہ انسان اپنے پاس جو کچھ رکھتا ہے۔ خدائے تعالیٰ کے حوالے کر دے۔ اس کی تمام قوتیں، اس کی تمام خواہشیں اس کے تمام جذبات اس کے تمام محبوبات غرضیکہ سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے انگوٹھے تک جو کچھ اس

کے اندر ہے اور جو کچھ اپنے سے باہر رکھتا ہے سب کچھ۔ ایک لینے والے کے سپرد کردے
اور تمام اپنے قوائے جسمانی و دماغی کے ساتھ خدا کے آگے جھک جائے اور ایک
مرتبہ ہر طرف سے منقطع ہو کر اور اپنے تمام رشتوں کو توڑ کر اس طرح گردن رکھ دے
کہ پھر کبھی نہ اٹھے نفس کی حکومت سے باغی ہو جائے اور احکام الٰہی کا مطیع و منقاد ہو
وہ حقیقت اسلامی کا قانون فطری ہے جو تمام کائنات عالم میں جاری و ساری ہے۔
اس کی سلطنت سے زمین و آسمان کا ایک ذرہ بھی باہر نہیں۔ ہر شے جو اس حیات کدہ
عالم میں وجود رکھتی ہے اپنے اعمال طبعی کے اندر اس حقیقت اسلامی کی ایک مجسم شہادت
ہے، کون ہے جو اس کی اطاعت دا[illegible] سے آزاد ہے اور اس کے سامنے سے
ایک جھکے ہوئے سر کو اٹھا سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ میں کبیر المتعال ہوں۔ پھر کون سی
ہستی ہے جو اس کی کبریائی و جبروت کے آگے اپنے اندر اسلامی انقیاد کی ایک
صدائے عجز نہیں رکھتی؟ زمین پر ہم چلتے ہیں اور آسمان کو ہم دیکھتے ہیں۔ لیکن کیا
دونوں اس حقیقت اسلامی کی طرف داعی نہیں ہیں۔

زمین کو دیکھو جو اپنے گرد غبار کے اندر ارواح نباتاتی کی ایک بہشت حیات
ہے جس کے الوان جمال سے اس حیات کدۂ ارضی کی ساری دل فریبی اور رونق ہے
جس کی غذا بخشی انسانی خون کے لئے سرچشمۂ تولید ہے اور جو اپنے اندر زندگیوں اور
ہستیوں کا ایک خزانۂ لازوال رکھتی ہے کیا اس کی وسیع سطح حیات پر ورپر ایک ہستی بھی
ہے جو اس حقیقت اسلامی کے قانون عام سے مستثنیٰ ہو؟ کیا اس کی کائنات نباتاتی کا ایک
خدائے اسلام کے قائم کئے ہوئے حدود و قوانین کا مُسلِم یعنی اطاعت شعار نہیں ہے۔
بیج جب زمین کے سپرد کیا جاتا ہے تو وہ فوراً اسے لیتی ہے۔ کیونکہ اس کے بنانے

والے نے اس کو ایسا ہی حکم دیا ہے۔ پھر اگر تم وقت سے پہلے واپس مانگو تو نہیں دے سکتی۔ کیونکہ اس کا سر خدا کے آگے جھکا ہوا ہے اور خدا نے ہر بات کے لئے ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔ وَلِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ۔ پس محال ہے کہ اس کی خلاف ورزی کرے اور حقیقت اسلامی کے قانونِ عام کی مجرم ہو۔

قانون الٰہی نے زمیں کی قوت نامیہ کے ظہور کے لئے مختلف دور مقرر کر دیئے ہیں اور ہر دور کے لئے ایک وقت خاص لکھ دیا ہے۔ زمین کی درستگی کے بعد اس میں بیج ڈالا جاتا ہے۔ آفتاب کی تمازت اس کو حرارت پہنچاتی ہے پانی کا بمقدار مناسب حصول اس کے نشوونما کو زندگی کی تازگی بخشتا ہے۔ یہ تمام چیزیں ایک خاص تسویہ و تناسب کے ساتھ اس کو مطلوب ہیں۔ پھر بیج کے گلنے اور سڑنے مٹی کے اجزائے نباتاتی کی آمیزش، کونپلوں کے پھوٹنے۔ ان کے بتدریج بلند ہونے اور اس کے بعد شاخوں کے انشعاب اور پتوں اور پھولوں کی تولید۔ ان تمام مرحلوں سے اس بیج کا درجہ بدرجہ گزرنا ضروری ہے۔ اور ہر زمانے کے لئے ایک حالت اور مدت مقرر کر دی گئی ہے۔ یہی تمام مختلف مراحل و منازل زمین کی پیداوار کے لئے ایک شریعتِ الٰہیہ ہیں۔ جس کی اطاعت، کائناتِ نباتات کی ہر روح پر فرض کر دی گئی ہے۔ پھر کیا ممکن ہے کہ زمیں ایک لمحہ، ایک منٹ اور ایک مستثنیٰ مثال کے لئے بھی اس شریعت کے مسلم ہونے یعنی اس کی اطاعت سے انکار کر دے۔ اور پھر اگر اس کی خلاف ورزی کی جائے تو کیا ممکن ہے کہ ایک دانہ بھی بار آور اور ایک پھول بھی شگفتہ ہو۔

ایک درخت ہے جو پانچ سال کے اندر پھل لاتا ہے۔ پھر تم کتنی ہی کوشش

کردو پانچ ماہ کے اندر کبھی پھل نہیں دے گا۔ ایک پھول ہے جس کے پودے کو زیادہ مقدار میں حرارت مطلوب ہے۔ پھر یہ محال ہے کہ وہ سائے میں زندہ رہ سکے۔ کیوں؟ اس لئے کہ پانچ سال کے اندر اس کا حد بلوغ کو پہنچنا۔ اور دھوپ کی تیزی میں اس کا نشو و نما پانا شریعت الٰہی نے مقرر کر دیا ہے۔ پس وہ مسلم ہے اور حقیقت اسلامی کا قانون عام اس کو سرکشی و خلاف ورزی کا سر اٹھانے نہیں دیتا۔

بَلْ لَّهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهُ قَانِتُوْنَ ط

اور جو کچھ آسمان میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سب اسی کا ہے اور سب اس کے حکم کے تابع اور منقاد ہیں۔

پس فی الحقیقت زمین کے عالم نظم و تدبیر میں جو کچھ ہے، حقیقت اسلامی کا ظہور ہے۔

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ط

اور زمین میں ارباب یقین کے لئے خدا کی ہزاروں نشانیاں بکھری پڑی ہیں۔

یہ سر بفلک پہاڑوں کی چوٹیاں جو اپنے عظیم الشان قامتوں کے اندر خلقت کائنات کی سب سے بڑی عظمت رکھتی ہے۔ یہ شیریں اور حیات بخش دریا جو کسی مخفی تعلیم کے نقشے کے مطابق زمین کے اندر گاہ مستقیم اور گاہ پرپیچ و خم راہ پیدا کرتے رہتے ہیں۔ یہ خوفناک و قہار سمندر جس کی بے کنار سطح مہیب کے نیچے طرح طرح کے دریائی حیوانات کی بے شمار اقلیمیں آباد ہیں۔ غور کیجئے کہ کیا سلطان اسلام کی حکومت سے باہر ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں کے سر گو بلند ہیں۔ مگر اطاعت کیشِ اسلام شعارانہ سر [illegible] ئے ہوئے ہیں۔ زمین کا جو گوشہ اور سمندر کا جو کنارہ ان کو دے دیا گیا ہے ممکن نہیں کہ وہ ایک انچ بھی اس سے باہر قدم نکال سکیں۔ اور

کے ارتقائے جسمانی کے لئے جو غیر محسوس رفتار ہو، شریعت الہیہ نے مقرر کر دی ہے، محال ہے کہ اس سے زیادہ آگے بڑھ سکیں۔ انقلابات طبعیہ کا حکم الہٰی ان کو ریزہ ریزہ کر دے پھر وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے۔ اسی طرح دریاؤں اور سمندروں کی طرف کان لگائیے کہ ان کی زبان حال اسی حقیقت اسلامی کی کیسی عجیب شہادت دے رہی ہے۔ آپ نے سمندروں کے طوفانوں اور موجوں کی صورت میں دیکھا ہے کہ پانی کی سرکشیاں کیسی شدید ہوتی ہیں لیکن اس سرکش اور مغرور دیو پر جب حقیقت اسلامی کی اطاعت و انقیاد کا قانون نافذ ہوا۔ تو اس عجز و تذلل کے ساتھ اس کا سر جھک گیا کہ ایک طرف میٹھے پانی کا دریا بہہ رہا ہے اور دوسری طرف کھارے پانی کا بحر ذخار ہے۔ دونوں اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ کوئی شے ان میں حائل نہیں، مگر نہ تو دریا کی مجال ہے کہ سمندر کی سرحد میں قدم رکھے اور نہ سمندر باہمہ قوت و قہاری اس کی جرأت رکھتا ہے کہ اپنی سرکش موجوں سے اس پر حملہ کرے

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ط فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ

اس نے کھارے اور میٹھے سمندروں کو جاری کیا۔ کہ دونوں آپس میں ملے ہوئے ہیں مگر پھر بھی ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے۔

کیونکہ دونوں کے درمیان اس نے حد فاصل قائم کر دی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ○

اور وہی قادر مطلق ہے جس نے دو دریاؤں کو آپس میں ملا دیا۔ ایک کا پانی شیریں و خوش ذائقہ اور ایک کا کھارا کڑوا اور پھر دونوں کے درمیان ایک

ایسی حدِ فاصل اور لاگ رکھ دی کہ دونوں باوجود ملنے کے بالکل الگ رہتے ہیں۔

اب ذرا نظر اوپر اٹھاؤ اور ملکوت السموات کے ان اجرامِ عظیمہ کو دیکھو جن کے مرئیاتِ بدیع سے یہ سطحِ نیلگوں ادراکِ انسانی کا سب سے بڑا منظرِ تحیر ہے۔ یہ عظیم الشان قہرمان تجلی جو روز ہمارے سروں پر چمکتا ہے۔ جس کی فیضان بخشی حیات تمیزِ قرب و بعد سے ماورا ہے جس کا جذب و انجذاب' کائناتِ عالمِ انسانی کے لئے تنہا وسیلۂ تنویر ہے اور جس کا قہرِ حرارت کسی تجلی گاہِ حقیقی کا سب سے بڑا عکس و ظلال ہے۔ غور کرو تو اپنے اندر حقیقتِ اسلامی کی کیسی موثر شہادت میں رکھتا ہے۔ وہ جس کی جبروت و عظمت کے آگے تمام کائناتِ عالم کا سر جھکا ہوا ہے۔ کیسے مسلم شعارانہ انکسار کے ساتھ' فاطر السموات کے آگے سربسجدہ کہ ایک لمحے اور ایک عشرِ دقیقے کے لئے بھی اپنے اعمال و افعال کے مقرر کردہ حدود سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔

تَبَارَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَّجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَّقَمَرًا مُّنِيرًا ۔ط

کیا مبارک ہے ذاتِ قدوس اس کی جس نے آسمان میں گردشِ سیارات کے دائرے بنائے اور اس میں آفتاب کی مشعل روشن کردی اور تیز روشن و منور چاند بنایا۔

پھر اسی طرح اور تمام اجرامِ سماویہ کو دیکھو۔ اور ان کے افعال و خواص کا مطالعہ کرو۔ ان کے طلوع و غروب' ایاب و ذہاب' حرکت و رجعت' جذب و انجذاب' اثر و تاثر اور فعل و انفعال کے لئے جو قوانین رب السماوات نے مقرر کر دیئے ہیں' کس طرح ان کی اطاعت و انقیاد کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ یہی قوانین ہیں جن کو قرآن حکیم حدود اللہ کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اور یہی دین ہے جو تمام نظام

کائنات کے لیے بمنزلہ مرکز قیام و حیات ہے۔ عالم ارضی و سماوی کا کوئی مخلوق نہیں جو اس دین الٰہی کا پیرو نہ ہو۔ اور آفتاب سے لے کر خاک کے ذرے تک کوئی نہیں جو اس کی اطاعت سے انکار کرے۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ط

اس کے حکم سے سورج اور چاند ایک حساب معین پر گردش میں ہیں اور تمام عالم نباتات کے سر اس کے آگے جھکے ہوئے ہیں اور اسی نے آسمان کو بلندی قرار دیا اور (قانون الٰہی کا) میزان بنایا کہ تم لوگ اندازہ کرنے میں حد اعتدال سے متجاوز نہ ہو۔

یہی نظام شمسی میں جس قدر نظم و تدبیر ہے، سب اسی حقیقت اسلامی کا ظہور ہے حقیقت اسلامی کی اطاعت و انقیاد نے ہر مخلوق کو اپنے اپنے دائرہ عمل میں محدود کر دیا ہے اور ہر وجود سر جھکائے ہوئے اپنے فرض کے انجام دینے میں مشغول ہے۔ اگر زمین اپنے محور پر حرکت کرتی ہوئی اپنے دائرہ کا چکر لگاتی ہے۔ اگر آفتاب کی کشش اس کو ایک بال برابر بھی ادھر ادھر نہیں کرنے دیتی اگر ہر ستارہ اپنے اپنے دائرہ حرکت کے اندر ہی محدود ہے۔ اگر تمام ستاروں کی باہمی جذب محیط ہمیشہ اس تسویہ و میزان کے ساتھ قائم رہتی ہے کہ عظیم الشان قوتوں کے پہاڑ آپس میں نہیں ٹکراتے اگر ان کی حرکت و سیر کی مقدار اور اوقات مقررہ میں طلوع و غروب ایک ایسا ناممکن التبدیل قانون ہے جس میں کبھی کمی بیشی نہیں ہوتی۔ اور اگر

لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ط

نہ تو آفتاب کے اختیار میں ہے کہ چاند کو جا لے اور نہ رات کے بس میں ہے کہ

دن سے پہلے ظاہر ہو جاتے اور تمام اجرام سماویہ اپنے اپنے دائروں کے اندر ہی پھر رہے ہیں۔

تو پھر اس کے کیا معنی ہیں؟ کیا یہ اعمال کائنات اس امر کی شہادت نہیں ہیں کہ دنیا میں اصل قوتِ صرف اسلام ہی کی قوت ہے اور اس عالم کا وجود صرف اسی لیے زندہ ہے کہ حقیقت اسلامی اس پر طاری ہو چکی ہے۔ ورنہ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی اس حقیقت کی حکومت دنیا سے اٹھ جائے تو تمام نظام عالم درہم برہم ہو جائے۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ○

کیا یہ دین الٰہی کو چھوڑ کر کسی اور کے آگے سر جھکانا چاہتے ہیں، حالانکہ آسمان اور زمین میں کوئی نہیں جو اس دین الٰہی کا مسلم یعنی مطیع و منقاد نہ ہو۔

اور آسمان و زمین پر کیا موقوف ہے۔ اگر خود اپنے اندر بھی دیکھیے تو جسم انسانی کا کون سا حصہ ہے جس پر حقیقت اسلامی طاری نہیں؟ خود آپ کو تو اس کے آگے جھکنے سے انکار ہے۔ لیکن اس کی خبر نہیں کہ آپ کے اندر جو کچھ ہے اس کا ایک ایک ذرہ کس کے آگے سر بسجدہ ہے۔

دل کے لئے یہ شریعت مقرر کر دی گئی کہ اپنے قبض و بسط سے جسم کے تمام حصوں میں خون گردش جاری رکھے کہ اس کا اضطراب والتہاب ہی روح کے سکون و حیات کا ذریعہ ہے۔ نیز حرکت کی ایک مقدار مقرر کر دی ہے اور خون کے دخل و خراج کے لئے ایک پیمانہ اعتدال بنا دیا۔ پھر ذرا اپنے بائیں پہلو پر ہاتھ رکھ کر دیکھئے کہ اس عجیب و غریب مضغۂ گوشت نے کس استغراق و محویت کے ساتھ حقیقتِ اسلامی

کے سامنے سر جھکا دیا ہے کہ ایک لمحہ کے لیے کبھی اس سے غافل نہیں؟ اور اگر یک چشم زدن کے لیے بھی سرکشی کا سر اٹھائے تو نظام حیات بدنی کا کیا حال ہو۔ اس طرح کارخانہ جسم کے ایک ایک پرزے کے تشریحی فرائض پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ آپ کے اندر سر سے پاؤں تک جس قدر زندگی ہے اس حقیقت اسلامی ہی کے نظام سے ہے؛ آنکھوں کا ارتسام، انعکاس و کانوں کی قوتِ سامعہ معدے کا فعل انہضام اور سب سے بڑھ کر طلسم سرائے دماغ کے عجائب و غرائب سب اسی لیے کام دے رہے ہیں کہ "مسلم" ہیں اور حقیقت اسلامی کے اطاعت شعار۔ آپ کے جسم کی رگوں میں جو خون دوڑ رہا ہے۔ کبھی آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ کس کے حکم کی سطوت و جبروت ہے جو اس رواں دسیل دریا کو دوڑا رہی ہے۔

وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ

اور اگر باہر کی طرف سے تمہاری آنکھیں بند ہیں تو کیا اپنے نفس کے اندر بھی نہیں دیکھتے

اور یہی اشارہ ہے جو اس آیت کریمہ میں کیا گیا ہے کہ:۔

سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ

ہم اپنی نشانیاں عالم کائنات کے مختلف اطراف و جوانب میں بھی دکھائیں گے۔ اور انسان کے اندر بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ دین الٰہی برحق ہے۔

اور یہی حقیقت اسلامی کی وہ اطاعت شعاری ہے جس کو لسان الٰہی نے عالم کائنات کی تسبیح و تقدیس سے تعبیر کیا ہے کیونکہ فی الحقیقت اس عالم کا ہر وجود اپنے لقائے اسلامی کی زبان حال سے اس سبوح و قدوس کی عبادت میں مشغول ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ؕ

تمام آسمان اور تمام زمینیں اور جو کچھ ان کے اندر ہے سب کے سب اسی خدا کی تسبیح و تقدیس میں مشغول ہیں اور کائنات میں کوئی چیز نہیں جو زبان اطاعت سے اس کی حمد و ثنا اور تسبیح و تقدیس نہ کرتی ہو مگر ان کی اس آواز کو نہیں سمجھتے اور اس پر غور نہیں کرتے۔

اور یہی وہ عہد و میثاق عبودیت تھا جس کا اقرار صحبت ازل کے سر عہد نامہ ذوق جام "بلیٰ" سے لیا گیا اور حقیقت اسلامی کی محویت اوّل نے سب کی زبان سے بے اختیارانہ اقرار کرا لیا۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى ؕ

اور وہ وقت یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے بنی آدم سے اس کی ذریت (بصورت تعین اولی) نکالا اور ان کے مقابلے میں خود انہی سے شہادت دلوا دی اس طرح کہ ان سے پوچھا: کیا میں آمر و حاکم اور رب الارباب نہیں ہوں؟ سب نے اطاعت کے سر جھکا دیئے کہ بیشک تو ہی مستحق اطاعت ہے اور اسی حقیقت اسلامی کے سر جھکانے کا نتیجہ وہ سربلندی ہے جو انسان کو تمام مخلوق ارضیہ میں حاصل ہے اور جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کا مظہر اور زمین پر اس کا خلیفہ قرار پایا۔ اس نے جب اللہ کے آگے سر اطاعت جھکا دیا تو اللہ نے ان تمام مخلوقات ارضیہ کو جن کے سر اس کے آگے جھکے ہوئے تھے حکم دیا کہ اسی جھکنے والے کے آگے تم بھی جھک جاؤ۔ کہ مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ

اور ہم نے شرف کرامت عطا فرمایا نسل انسانی کو اور تمام خشکی و تری کی چیزوں کو حکم دیا کہ اس کے مطیع ہو جائیں اور اس کو اٹھائیں اور اس کے لیے دنیا میں بہترین اشیا پیدا کریں۔ کائنات کی ہر مخلوق نے اس حکم کی تعمیل کی کیونکہ ان کے سر تو ان کے آگے جھکے ہوئے تھے پر ایک شر پرستی تھی جس نے غرور و تکبر کے ساتھ سر اٹھایا اور انسان کی اطاعت سے انکار کر دیا۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

اور جب تمہارے پروردگار نے ملائک کو حکم دیا کہ نوع آدم کے آگے اطاعت کر کے سر جھکا دو تو سب جھک گئے مگر ایک ابلیس تھا جس نے انکار کیا اور کبر و غرور کا سر اٹھایا اور وہ یقیناً کافروں میں سے تھا۔

وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ۔ کیونکہ اسلام کے معنی جھکنے کے ہیں اور کفر نام ہے سرکشی کا۔ ابلیس نے جھکنے سے انکار کیا، اور سرکشی کا سر اٹھایا پس وہ ضرور کافروں میں سے تھا۔ یہی ایک شریر طاقت ہے جو تمام سرکشیوں اور ہر طرح کے ظلم و طغیان کا عالم میں مبدا ہے یہی وہ تاریکی کا اہرمن ہے جو یزدانی نور و ضیا کے مقابلے میں اپنے تئیں پیش کرتا ہے۔ یہی وہ خسران و ضلالت ہے جو انسان کے پاؤں میں اپنی اطاعت کی زنجیریں ڈال کر اس کو اسلامی اطاعت سے باز رکھتا ہے۔ یہی وہ ابو الکفر ہے جس کی ذریت انسان کے اندر اور باہر دونوں میں پھیلی ہوئی ہے اور جو جب چاہتا ہے انسان کے ٹھیک اس دم کے اندر پھونک کر اپنی ضلالت کے لیے راہ پیدا کر لیتا ہے اور یہی وہ اسلام کی حقیقت کی اصل ضد اور اس کی قوت ہدایت کا قدیمی دشمن ہے جس نے اپنے کفر کے پہلے ہی دن کہہ دیا کہ:۔

قَالَ أَرَأَيْتَكَ هٰذَا الَّذِي كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ أَخَّرْتَنِ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ إِلَّا قَلِيلًا ط

شیطان نے آدم کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہی ہے جس کو تو نے مجھ پر فوقیت دی ہے لیکن تو مجھ کو روز قیامت تک مہلت دے تو میں اپنی قوت ضلالت سے اس کی تمام نسل کو تباہ کر دوں البتہ وہ تھوڑے سے لوگ جن پر میرا جادو نہ چلے گا میری حکومت سے باہر رہ جائیں گے۔ لیکن خدائے تعالیٰ نے یہ کہہ کر جھڑک دیا کہ

اذْهَبْ فَمَن تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَإِنَّ جَهَنَّمَ جَزَاؤُكُمْ جَزَاءً مَّوْفُورًا ط وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُم بِصَوْتِكَ وَأَجْلِبْ عَلَيْهِم بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ وَعِدْهُمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ط

جا! دور ہو! جو شخص نسل آدم میں سے تیری متابعت کرے گا اس کے لئے عذاب جہنم کی پوری سزا ہو گی۔ ان میں سے جن جن کو تو اپنی پُر فریب صداؤں سے بہکا سکتا ہے بہکا لے، ان پر اپنی فوج کے سواروں اور پیادوں سے چڑھائی کر دے، ان کی مال و دولت اور اولاد و فرزند میں شریک ہو کر اپنا ایک حصہ لگا لے اور ان سے جتنے جتنے جھوٹے دعوے کر سکتا ہے کرے۔ شیطان کے دعوے محض دھوکے اور فریب سے زیادہ نہیں ہیں، پھر یہی ہے جس کو خواہ تم اپنے سے خارج سمجھو یا خود اپنے اندر تلاش کرو۔ اس کے حکم ضلالت کے احکام دونوں جگہ جاری ہیں۔ وہ کبھی تمہاری رگوں کے اندر کے خون میں اپنی ذریات کو اتار دیتا ہے تاکہ تم پر اندر سے حملہ کرے کبھی باہر سے آکر تمہارے دماغ، جو اس پر قابض ہو جاتا ہے تاکہ تم کو اپنے آگے جھکا کر خدا

کے آگے جھکنے سے باز رکھے۔ وہ کبھی تمہارے مال و متاع میں، کبھی محبت اہل و عیال میں، اور کبھی عام محبوبات و مرغوبات دنیویہ میں شریک ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح تمہاری ہر شے خدا کی جگہ اس کے لئے ہو جاتی ہے، تم چلتے ہو تو اس کے لئے کھاتے ہو تو اس کے لئے اور پہنتے ہو تو اس کے لئے۔ حالانکہ حقیقت اسلامی چاہتی ہے کہ تم جو کچھ کرو خدا کے لئے کرو۔

ہر تاریکی جو روشنی کو چھپانا چاہتی ہے، ہر سیاہی جو سفیدی کے مقابلے میں ہے، ہر تمرد و سرکشی جو اطاعت الٰہی کی ضد ہے، اور ہر وہ سرکشی جو حقیقت اسلامی سے خالی ہے۔ یقین کرو کہ شیطان ہے اور دنیا کی ہر لذت اور ہر راحت جس کا انہماک اس درجہ میں پہنچ جائے کہ وہ حقیقت اسلامی کی انقیاد پر غالب آجائے، شیطان کی ذریت میں داخل ہے، پس اس کے وجود کی نسبت کیوں سوچتے ہو۔ کہ وہ کیا ہے، اور کہاں ہے۔ اس کو دیکھو کہ وہ تمہارے ساتھ کر کیا رہا ہے۔ مسیح نے کہا کہ نوکر دو آقاؤں کو خوش نہیں کر سکتا۔ اور قرآن کریم کہتا ہے۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهٖ ؕ

اللہ نے کسی انسان کے پہلو میں دو دل نہیں رکھے۔ بلکہ دل ایک ہی ہے۔

پس ایک دل کے سر بھی دو چوکھٹوں پر نہیں جھک سکتے اور دنیا میں دل ہی ایک ایسا جوہر ہے جس کی تقسیم نہیں ہو سکتی، یا وہ قوت شیطانی کا مطیع و منقاد ہوگا، یا وہ قوت رحمانی کا، یا وہ شیطان کا عبادت گزار ہوگا یا خدائے رحمان کا۔ اور عبادت و پرستش سے مقصود یہی نہیں ہے کہ پتھر کا ایک بت تراش کر اس کے آگے سر بسجدہ ہو، یہ تو وہ ادنیٰ شرک ہے جس سے قریش مکہ کا خیال بھی بلند تھا۔ بلکہ ہر وہ انقیاد،

ہر وہ سخت و شدید انہماک اور وہ استغراق و استیلا جو حقیقت اسلامی کے انقیاد اور محبت الٰہی پر غالب آجائے، اور تم کو اس طرح اپنی طرف کھینچ لے کہ جس کی طرف تمہیں کھنچنا تھا، اس کی طرف سے گردن موڑ لو۔ درحقیقت وہی تمہاری پرستش و عبادت کا بت ہے۔ اور تم اس کے بت پرست، اور اصل و حقیقی شرک کے مشرک یہی سبب ہے کہ حقیقت شناسان توحید نے فرمایا! مَن شَغَلَكَ مِنَ اللّٰهِ فَهُوَ صَنَمُكَ وَمِنَ الْهَكَ فَهُوَ مَوْلاكَ۔ جس چیز نے تم کو اللہ سے الگ کر کے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہی تمہارے لئے بت ہے اور تم اس کے پوجنے والے ہو، خواہ وہ جنت کی ہوس اور حور و قصور کا شوق ہی کیوں نہ ہو رابعہ بصریہ سے جب پوچھا کہ۔ مَا الشِّرْكُ؟ شرک حقیقت کیا ہے؟ تو اس نے کہا: طَلَبُ الْجَنَّةِ وَالْاِعْرَاضُ عَنْ رَبِّهَا۔ جنت کی طلب کرنا اور مالک جنت کی طرف سے غافل ہو جانا۔ یہی سبب ہے کہ قرآن کریم نے ہوائے نفس کو معبود و الٰہ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے؟

اَرَأَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ ط

آیا تم اس گمراہ کو نہیں دیکھتے جس نے اپنے ہوائے نفس کو معبود بنا لیا۔

اور کس قدر میرے مطلب کو واضح تر کر دیتی ہے؟ سورۂ یٰسین کی وہ آیت جب کہ فرمایا:

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَیْكُمْ یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ
عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِیْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ط

کیا ہم نے تم سے اے اولاد آدم اس کا عہد نہیں لیا تھا کہ شیطان کی پوجا سے باز رہو۔ کیونکہ وہ تمہارا ایک دشمن ہے۔ اور صرف ہماری ہی عبادت کرو کہ یہی ہدایت کی راہ ہے؟ یہاں شیطان کی اطاعت کو بندگی اور عبادت کے لفظ سے تعبیر کیا اور عبادت الٰہی

کے اس عہد و میثاق کو یاد دلاتا۔ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کے سوال کا جواب، تمام بنی آدم سے لیا جا چکا ہے پس حقیقت اسلامی یہ چاہتی ہے کہ انسان قوت شیطانی سے باغی ہو کر صرف خدائے تعالیٰ کا ہو جائے اور اس کے آگے سر انقیاد جھکا کر اپنے "میثاق" "بلیٰ" کی تجدید کرے، تاکہ اللہ کا بندہ ہو، اور اللہ کا بندہ وہی ہے جو شیطان کا نہیں ہے۔

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطَانٌ وَکَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیْلًا؟

خدائے تعالیٰ نے شیطان سے کہا کہ جو میرے بندے ہیں۔ ان پر تیری حکومت نہیں چلنے کی اور خدا اپنے بندوں کی کارسازی کے لئے بس کرتا ہے۔

یہاں ان بندگان مخلصین کو جو شیطان کے اثر و استیلا سے محفوظ ہوں۔ خدا نے اپنی طرف نسبت دی کہ "اِنَّ عِبَادِیْ" جو لوگ میرے بندے ہیں، حالانکہ کون ہے جو اس کا بندہ نہیں ہے مگر مقصود یہ تھا کہ میرے بندے تو وہی ہیں جو صرف میرے لئے ہیں، لیکن جنہوں نے میرے آگے سر کو جھکا کر پھر اپنے سر کو دوسری چوکھٹوں پر بھی جھکا دیا ہے۔ تو دراصل انہوں نے بندگی کا رشتہ کاٹ دیا گو وہ میرے تھے لیکن اب میرے باقی نہیں رہے۔ کیونکہ انہوں نے توحید محبت کو شوکت غیر سے محفوظ نہیں رکھا۔ افسوس کہ یہ موقع اس بیان کی تشریح و تفصیل کا مقتضی نہیں اور مطلب اصل منتظر رجوع ہے؟

پس لفظ اسلام کے معنی کسی چیز کے حوالہ کر دینا اور گردن رکھ دینے کے ہیں اور یہی حقیقت دین اسلام کی ہے۔ کہ انسان اس رب الارباب کے آگے اپنی گردن رکھ دے۔ اور اس انقطاع اور انقیاد حقیقی کے ساتھ گویا اس نے اپنی گردن اس کے سپرد کر دی اور کوئی حق و ملکیت اور مطالبہ اس کا باقی نہیں رہا۔ اب وہ اپنی کسی شے کا خواہ وہ اس کے اندر ہو یا باہر مالک نہیں رہا۔ بلکہ ہر شے اس قدرت الٰہیہ کی ہو گئی جس کا نام "اسلام" ہے۔

انسان کے اندر انسان کے باہر سینکڑوں مطالبات ہیں جو اس کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں، اس کے اندر سب سے بڑے "مظہر ابلیس" یعنی نفس کی قوت قاہرہ کا دست طلب بڑھا ہوا ہے اور وہ ہر دم اور ہر لمحے اس کی ہر شئے کو اس سے مانگ رہا ہے تاکہ اس کو خدا کی جگہ اپنا لے۔ باہر دیکھتا ہے تو محبوباتِ دنیوی اور ممالک حیات کے دام، قدم قدم پر بچھے ہوئے ہیں اور جس طرف جاتا ہے اس سے اس کا قلب و دماغ مانگا جاتا ہے تاکہ اسے خدا سے چھین لیں۔ جذبات اور خواہشوں کے بے اعتدالانہ اقدامات کی فوجوں نے اس کے دماغ کا محاصرہ کر لیا ہے اور آزمائشوں اور امتحانوں کی کثرت سے اس کا ضمیر اور دل ایک دائمی شکست سے مجبور ہے، اہل و عیال عزت و جاہ، مال و دولت کے قناطیر مقنطرہ اور وہ تمام چیزیں جن کو قرآن 'زینت حیات' سے تعبیر کرتا ہے اس کے کمزور دل کے لیے اپنے اندر ایک ایسا پر کشش سوال رکھتی ہیں جس کو رد کرنا اس کے لیے سب سے بڑی آزمائش ہو جاتا ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ط

انسان کی حالت اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اس کے لیے دنیا کی ہر مرغوب چیز مثلاً اہل و عیال، سونے چاندی کے ڈھیر، عمدہ گھوڑے، مویشی اور کھیتی کاری میں بڑی دلبستگی ہے۔

پس انقیادِ اسلامی کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی جنس دل و جان کے بہت سے خریدار نہ بنائے بلکہ ایک ہی خریدار سے معاملہ کرے، وہ ان مانگنے والوں سے جن کے ہاتھ اس کی طرف بڑھے ہوتے ہیں، اپنے تئیں بچائے اور اس ایک ہاتھ کو دیکھے جو باوجود اس کی طرح طرح کی بے وفائیوں کے، پھر بھی وفا و محبت کے ساتھ اس کی طرف

بڑھا ہوا ہے اور گو اس نے اپنے متاع دل و جان کو کتنا ہی ناقص اور خراب کر دیا ہو لیکن بہتر ہے بہتر قیمت دے کر خریدنے کے لئے موجود ہے۔ اور صدائے محبت مَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْهِ ذِرَاعًا سے ہر آن و ہر لمحہ عشق نواز ہر قلب مشتاق ہے۔ خواہ کتنی پیمان شکنیاں کرے لیکن وہ اپنا عہد محبت آخر تک نہیں توڑتا کہ یَا ابْنَ آدَمَ لَوْ کَانَ ذُنُوْبُکَ عَنَانَ السَّمَآءِ ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِیْ لَغَفَرْتُ لَکَ۔ اور جس کی وفائے محبت کا یہ حال ہے کہ خواہ تم عمر اسے کتنا ہی روٹھا ہوا رکھو لیکن اگر انابت و اضطرار کا ایک آنسو بھی سفارش کے لئے ساتھ لے جاؤ تو وہ پھر بھی سننے کے لئے تیار ہے۔ اور جس کے دروازے سے خواہ کتنا ہی بھاگو لیکن پھر بھی اگر شوق کا ایک قدم بڑھاؤ تو وہ قدم بڑھ کر تمہیں لینے کے لئے منتظر ہے۔

عاشقاں ہر چند مشتاق جمال دلبراند
دلبراں بر عاشقاں از عاشقاں عاشق تراند

جس کا دروازۂ قبولیت کبھی بند نہیں، اور جس کے یہاں مایوسی سے بڑھ کر اور کوئی جرم نہیں

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ط

اے وہ میرے بندو! کہ گناہوں میں ڈوب کر تم نے اپنے نفوس پر سخت زیادتی کی ہیں، خواہ تم کیسے ہی غرق معصیت ہو، مگر پھر بھی اس محبت فرما کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ یقیناً وہ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا۔ بیشک وہی درگزر کرنے والا ہے، اور اس کی بخشش رحم عام ہے۔

با گنہ گاراں بگو ہم تا نیند از ند دل
من ز فلسفۂ دوست را در بے وفائی یافتم

اب اس قدر توطیہ و تمہید کے بعد قرآن کریم کی طرف رجوع کرو کہ وہ اس حقیقت اسلامی کو بار بار دوہراتا ہے یا نہیں؟ اول تو خود لفظ اسلام ہی اس حقیقت کے وضوح کے لئے کافی ہے۔ لیکن اگر کافی نہ ہو تو جس قدر کہہ چکا ہوں اس سے زیادہ کہنے کے لئے ابھی باقی ہے۔ قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی اسلام کا لفظ آیا ہے، غور کیجئے تو اس حقیقت کے سوا اور کوئی معنی ثابت نہ ہوں گے۔

وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ؕ

اور جس نے اپنا منہ اللہ کی طرف جھکا دیا یا اپنی گردن اللہ کے حوالے کر دی، اور اعمال حسنہ انجام دیئے تو بس دین الٰہی کی مضبوط رسی اس کے ہاتھ آگئی۔

ایک دوسری جگہ فرمایا ہے:-

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ ط

اور اس شخص سے بہتر کس کا دین ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے لئے اپنا سر جھکا دیا یا اللہ کے حوالہ کر دیا۔ اور اعمال حسنہ انجام دیئے۔

سورہ آل عمران کی ایک آیت میں جو اسلام کی حقیقت کی تفصیل و تشریح کے لئے ایک جامع ترین آیت ہے۔ اسلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ط

دین اللہ کے یہاں صرف ایک ہی ہے اور وہ اسلام ہے۔ پھر اس کے بعد کہا۔

وَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِىَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ
لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ
وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ط

اگر منکرین اس بارے میں تم سے حجت کریں تو کہہ دو کہ میں نے اور میرے پیروؤں نے تو صرف اللہ ہی کے آگے اپنا سر جھکا دیا ہے۔ اور پھر یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب سے پوچھو کہ بھی اس کے آگے جھکے یا نہیں؟ سو اگر وہ جھک گئے یعنی مسلم ہو گئے تو بس انہوں نے ہدایت پالی اور اگر انہوں نے گردنیں موڑ لیں تو وہ جانیں اور ان کا کام جانے۔ تمہارا فرض تو حکم الٰہی پہنچا دینا تھا۔ اور اللہ اپنے بندوں کو ہر حال میں دیکھ رہا ہے۔

اسی طرح دوسری جگہ فرمایا ہے۔

وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعَالَمِیْنَ ط

اور مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ ہر طرف سے منہ پھیر کر اس کے آگے جھک جاؤ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں ہر جگہ اسلام کے ساتھ منکرین اسلام کے لیے "ولی" اور "اعرض" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ولی عن الشئ کے معنی لغت میں "اعرض" کے ہیں، اور تولی عنہ اور اعرض عنہ ہر جگہ پاؤ گے۔ یعنی کسی چیز کی طرف سے منہ موڑ لینا اور گردن پھیر لینا وَاِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ آیَاتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ یَسْمَعْهَا اور جب ان میں سے کسی منکر کو قرآن کی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو غرور سے اکڑتا ہوا گردن پھیر کر چل دیتا ہے۔

اسی طرح اور سینکڑوں مقامات میں فرمایا:۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ ط

اگر وہ تیری طرف سے گردن پھیر لیں تو کہہ دے کہ مجھ کو خدا بس کرتا ہے۔
وَلَّوْا عَلٰى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ط

جب کفار کے آگے ذکر الٰہی کرو تو وہ پیچھے کی طرف منہ موڑ کر نفرت کناں چل دیتے ہیں۔
چونکہ اسلام کی حقیقت اللہ کے آگے سر جھکا دینا اور اپنی گردن سپرد کر دینا ہے۔
اس لئے اس سے انکار کو ہر جگہ "تولی" اور "اعرض" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا
عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ؕ

اور اسی طرح اللہ اپنی نعمتیں تم پر پوری کرتا ہے تاکہ تم اس کے آگے جھکو۔ اور اے پیغمبر اگر باوجود اس کے بھی لوگ گردن نہ جھکائیں تو تمہارا فرض تو صرف حکم الٰہی پہنچا دینا ہے۔
پس یہی وہ اصل اسلامی ہے جس کو قرآن جہاد فی سبیل اللہ سے تعبیر کرتا ہے اور کبھی اسلام کی جگہ جہاد، اور کبھی جہاد کی جگہ اسلام کبھی مسلم کی جگہ مجاہد اور کبھی مجاہد کی جگہ مسلم بولتا ہے۔ اس لئے کہ حقیقت جہاد اپنا سب کچھ اس کے لئے قربان کر دینا ہے۔ ہر وہ کوشش اور سعی جو اس کی خاطر ہو وہ جہاد ہے۔ خواہ ایثار جان کی سعی ہو یا قربانی مال و اولاد کی جدوجہد۔ اور یہی حقیقت اسلام ہے کہ اپنا سب کچھ اس کے سپرد کر دینا۔ پس جہاد اور اسلام ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں اور ایک ہی معنی کے لئے دو مرادف الفاظ ہیں۔ اور اسلام کے معنی جہاد ہیں۔ اور جہاد کے اسلام۔ پس کوئی ہستی مسلم ہو نہیں سکتی جب تک کہ مجاہد نہ ہو، اور کوئی مجاہد ہو نہیں سکتا جب تک مسلم نہ ہو۔ اسلام کی لذت اس بدبخت کے لئے حرام ہے جس کا ذوق ایمانی لذت جہاد سے محروم ہو، اور زمین پر گو اس نے اپنا نام مسلم رکھا ہو لیکن اس کو کہہ دو کہ آسمانوں میں اس کا شمار کفر کے زمرے میں ہے۔ آج جب ایک دنیا لفظ "جہاد" کی دہشت سے کانپ رہی ہے، جب کہ عالم مسیحی کی نظروں میں یہ لفظ ایک عفریت مہیب

یا ایک حریہ بے امان ہے، جب کہ اسلام کے مدعیان حمایت نصف صدی سے کوشش کر رہے ہیں، کہ کفر کی رضا کے لئے اسلام کو مجبور کریں کہ اس لفظ کو لغت سے نکال دے جب کہ بظاہر انہوں نے کفر و اسلام کے درمیان ایک راضی نامہ لکھ دیا کہ اسلام لفظ جہاد کو بھلا دیتا ہے۔ کفر اپنے توحش کو بھول جائے۔ اور جب کہ آج کل کے ملحدین مسلمین اور مفسدین کا ایک "حزب الشیطان" بے چین ہے کہ بس چلے تو یورپ سے درجۂ تقرب عبودیت حاصل کرنے کے "تحریف الکلم عن مواضعہ" کے بعد سرے سے اس لفظ کو قرآن سے نکال دے تو پھر کیا ہے کہ میں نہ صرف "جہاد" کو ایک رکن اسلامی۔ ایک فرض دینی، ایک حکم شریعت بتلاتا ہوں، بلکہ صاف صاف کہتا ہوں کہ اسلام کی حقیقت ہی جہاد ہے" دونوں لازم و ملزوم ہیں، اسلام سے اگر "جہاد" کو الگ کر لیا جائے تو وہ ایک لفظ ہوگا۔ جس میں معنی ہے۔ ایک اسم ہوگا، جس کا مسمٰی نہیں ہے، ایک قشر محض ہوگا جس سے مغز نکال لیا گیا ہے۔ پھر کیا میں ان تمام اعمال مصلحین متفرنجین کو غارت کرنا چاہتا ہوں، جو انہوں نے تطبیق بین التوحید والتثلیث یا اسلام اور مسیحیت کے اندر اتحاد کے لئے انجام دی ہیں؟ وہ اصلاح جدید کی شاندار عمارتیں جو مغربی تہذیب و شائستگی کی ارض مقدس پر کھڑی کی گئی ہیں کیا دعوت جہاد دے کر جنود مجاہدین کو بلاتا ہوں کہ اپنے گھوڑے کے سموں سے انہیں پامال کر دیں اور پھر کیا چاہتا ہوں کہ اسلام کی زندگی کا افق جو حرارت حیات کی گرد سے پاک کر دیا گیا تھا مجاہدین کی اڑائی ہوئی خاک سے پھر غبار آلود ہو جائے۔

ہاں! اے غارت گران حقیقت اسلامی۔ اے دزدان متاع ایمانی، اور اے

مفسدین ملت و مدعیان اصلاح نماں میں ایسا ہی چاہتا ہوں، میری آنکھیں ایسا ہی دیکھنا چاہتی ہیں، میرا دل ایسے ہی وقت کے لئے بے قرار ہے، خدائے ابراہیم و محمد علیہما السلام کی شریعت ایسا ہی چاہتی ہے۔ قرآن کریم اس کو حقیقتِ اسلامی کہتا ہے، وہ اس اسوۂ حسنہ کی طرف سے اپنے پیروؤں کو بلاتا ہے اسلام کا اعتقاد اس کے لئے ہے اس کی تمام عبادتیں اس کے لئے ہیں، اس کے تمام جسم اعمال کی روح میں یہی شے ہے، اور یہی چیز ہے جس کی یادگار اس نے ہمیشہ زندہ رکھنا چاہا اور عید الاضحیٰ کو یوم جشن و مسرت بنایا۔

وحدت اجتماعیہ

اس مقام کی مزید وضاحت کے لئے بہتر ہوگا کہ دو خاص اصطلاحی لفظوں کے معانی پر آپ پہلے غور کریں، ایک اجتماع اور ائتلاف ہے دوسرا اشتات اور انتشار، نہ صرف امت اسلامیہ بلکہ تمام اقوام عالم کی موت وحیات، ترقی وسعادت وشقاوت کے جو اصولی اسباب و مراتب، قرآن حکیم نے بیان کئے ہیں، ان کی سب سے زیادہ اہم حقیقت انہی الفاظ میں پوشیدہ ہے۔

اجتماع کے معنی ہیں ضَمُّ الشَّیْءِ بِتَقْرِیبِ بَعْضِهٖ مِنْ بَعْضٍ (مفردات امام راغب ۹۵) یعنی مختلف چیزوں کا باہم اکٹھا ہو جانا اور ائتلاف سے ہے اس کے معنی ہیں مَا جُمِعَ مِنْ اَجْزَاءٍ مُخْتَلِفَةٍ وَرُتِّبَ تَرْتِیْبًا قُدِّمَ فِیْهِ مَا حَقُّهٗ اَنْ یُّقَدَّمَ وَاُخِّرَ فِیْهِ مَا حَقُّهٗ اَنْ یُّؤَخَّرَ (مفردات ۱۹) یعنی مختلف چیزوں کا اس تناسب اور ترتیب کے ساتھ اکٹھا ہو جانا کہ جس چیز کو جس جگہ ہونا چاہئے

وہی جگہ اسے ملے، جو پہلے ہونے کی حق دار ہے وہ پہلے رہے جس کو آخری جگہ ملنی چاہیے، وہ آخری جگہ جائے، عید اجتماع و ائتلاف سے مقصود وہ حالت ہے جب مختلف کارکن قوتیں کسی ایک مقام، کسی ایک مرکز، ایک سلسلے، ایک وجود، ایک طاقت اور ایک فرد واحد میں اپنی قدرتی اور مناسب ترتیب کے ساتھ اکٹھی ہو جاتی ہیں، اور تمام مواد قومی اعمال و افراد پر ایک اجتماعی و انضمامی دور طاری ہو جاتا ہے، بجز یہ کہ ہر قوت اکٹھی، ہر ہمہ گر جڑا اور ملا ہوا ہے، ہر چیز بندھی اور سمٹی ہوئی، ہر فرد زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے متحد و متصل ہو جاتا ہے کسی چیز، کسی گوشے، کسی عمل میں علیحدگی نظر نہیں آتی، جدائی، انتشار اور الگ الگ جز جز، فرد فرد ہو کر رہنے والی حالت نہیں ہوتی، مادہ میں جب یہ اجتماع و انضمام پیدا ہو جاتا ہے تو اس سے تخلیق و تکوین اور وجود ہستی کے تمام مراتب ظہور میں آتے ہیں، اسی کو قرآن حکیم نے اپنی اصطلاح میں مرتبہ تخلیق و تسویہ سے بھی تعبیر کیا ہے۔ اَلَّذِی خَلَقَ فَسَوّٰی یس زندگی اور وجود نہیں ہے مگر اجتماع و ائتلاف اور موت و فنا نہیں ہے مگر اس کی ضد یہی حالت جب افعال و اعمال پر طاری ہوتی ہے تو اخلاق کی زبان میں اس کو خیر، اور شریعت کی زبان میں عمل صالح اور حسنات کہتے ہیں، جب جسم انسانی پر طاری ہوتی ہے تو طب کی اصطلاح میں تندرستی سے تعبیر کی جاتی ہے اور حکیم کہتا ہے کہ یہ زندگی ہے، اور پھر یہی حالت ہے کہ جب قومی و جماعتی زندگی کی قوتوں اور عملوں پر طاری ہوتی ہے تو اس کا نام حیات قومی و اجتماعی ہوتا ہے اور اس کا ظہور قومی اقبال و ترقی اور نفوذ و تسلط کی شکل میں دنیا دیکھتی ہے۔ الفاظ بہت سے ہیں، معنی ایک ہے، مظاہر گو مختلف، ہیں مگر اس حکیم یگانہ و واحد کی ذات کی طرح اس کا قانون حیات

وجود بھی اس کائنات ہستی میں ایک ہی ہے۔ ولنعم ما قیل

اس حالت کی ضد اشتات وانتشار ہے، اشتات اشتت سے ہے۔ جس کے معنی لغت میں تفریق اور الگ الگ ہو جانے کے ہیں یقال شتت جمعہم شتاً و شتاتاً وجاؤا اشتاتا اے متفرقی النظام (مفردات ۲۵۶) قرآن حکیم میں ہے۔ یومئذ یصدر الناس اشتاتا اور من نبات شتّٰی اور وقلوبہم شتّٰی اے مختلفۃ انتشار نشر سے ہے اس کے معنی بھی الگ الگ ہو جانے کے ہیں۔ یعنی تفرق کے۔ سورۂ جمعہ میں ہے۔ فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا یعنی تفرقوا۔

اشتات وانتشار سے مقصود وہ حالت ہے۔ جب اجتماع و ائتلاف کی جگہ الگ الگ ہو جائے، متفرق اور پراگندہ ہونے اور باہمد گر علیحدگی و بیگانگی کی حالت پیدا ہو جائے۔ یہ حالت جب مادہ پر طاری ہوتی ہے تو تکوین کی جگہ فساد اور وجود کی جگہ عدم و فنا کا اس پر اطلاق ہوتا ہے۔ جسم پر طاری ہوتی ہے تو اس کا نام پہلے بیماری اور پھر موت ہے، اعمال پر طاری ہوتی ہے تو اس کو قرآن حکیم اپنی اصطلاح میں عمل سوء اور عصیان سے تعبیر کرتا ہے۔ اور پھر یہی چیز ہے کہ جب قوموں اور امتوں کی اجتماعی زندگی پر طاری ہوتی ہے تو دنیا دیکھتی ہے کہ اقبال کی جگہ ادبار عروج کی جگہ تسفل ترقی کی جگہ تنزل عظمت کی جگہ ذلت حکومت کی جگہ محکومی اور بالآخر زندگی جگہ موت اس پر چھا گئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں جابجا اجتماع و ائتلاف کو قومی زندگی کی سب سے بڑی بنیاد اور اس لئے انسان کے لئے اللہ کی جانب سے سب سے بڑی رحمت و نعمت قرار دیا ہے اور اس کو اعتصام بحبل اللہ اور اسی طرح کی تعبیرات عظیمہ سے موسوم کیا ہے، مسلمانوں کے اولین مادہ تکوین امت یعنی اہل عرب کو مخاطب کر کے اور پھر تمام عرب و عجم سے فرمایا:

وَاعتَصِمُوا بِحَبلِ اللّٰہِ جَمِیعاً وَّلَا تَفَرَّقُوا وَاذکُرُوا نِعمَتَ اللّٰہِ عَلَیکُم

اِذ کُنتُم اَعدَاءً فَاَلَّفَ بَینَ قُلُوبِکُم فَاَصبَحتُم بِنِعمَتِہٖٓ اِخوَانًا ط

سب سے مل جل کر اور پوری طرح اکٹھے ہو کر اللہ کی رسّی مضبوط پکڑ لو۔ سب کے ہاتھ اسی ایک حبل اللہ سے وابستہ ہوں، اللہ کا یہ احسان یاد کرو کہ کیسی عظیم الشان نعمت ہے جس سے سرفراز کئے گئے۔

تمہارا یہ حال تھا کہ بالکل بکھرے ہوتے اور ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اللہ نے تم سب کو باہم ملا دیا اور اکٹھا کر دیا، پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اب بھائی بھائی ہو گئے ہو۔ اس نے تمہیں بتا دیا کہ اشتات وانتشار کی زندگی کو بقا و قیام نہیں ہو سکتا۔ وہ بلا کی ایک آگ ہے جس کے دہکتے ہوئے شعلوں کے اوپر کبھی قومی زندگی نشوونما نہیں پا سکتی۔

وَکُنتُم عَلٰی شَفَا حُفرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنقَذَکُم مِّنہَا کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُم اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُم تَہتَدُونَ ط

اور تمہارا حال یہ تھا کہ آگ کے دہکتے ہوئے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے۔ پر اللہ نے تمہیں بچا لیا۔ اللہ اپنے فضل و رحمت کی نشانیاں اس طرح کھولتا ہے تاکہ کامیابی کی راہ پا لو۔ یہ بھی جا بجا بتلا دیا کہ قوموں اور ملکوں میں اس اجتماع و ائتلاف کی صالح حقیقی زندگی پیدا کر دینا محض انسانی تدبیر سے ممکن نہیں، دنیا میں کوئی انسانی تدبیر "امت" نہیں پیدا کر سکتی، یہ کام صرف اللہ ہی کی توفیق و رحمت اور اس کی وحی و تنزیل کا ہے کہ بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک بنا دے۔

لَو اَنفَقتَ مَا فِی الاَرضِ جَمِیعاً مَّآ اَلَّفتَ بَینَ قُلُوبِہِم وَلٰکِنَّ اللّٰہَ اَلَّفَ بَینَہُم اِنَّہٗ عَزِیزٌ حَکِیمٌ ط

اگر تم زمین کا سارا خزانہ بھی خرچ کر ڈالتے جب بھی ان بکھرے ہوئے دلوں کو محبت واتحاد کے ساتھ جوڑ نہیں سکتے تھے۔ یہ اللہ ہی کا فضل ہے جس نے متفرق دلوں کو اکٹھا کر دیا اور اسی لئے قرآن حکیم ظہور شریعت و نزول وحی کا پہلا نتیجہ یہ قرار دیتا ہے کہ اجتماع و ائتلاف پیدا ہو اور بار بار کہتا ہے کہ تفرقہ و انتشار شریعت و وحی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ اور اسی لئے یہ نتیجہ شریعت ہے۔

فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰی جَآءَهُمُ الْعِلْمُ وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ
فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ وَلَا تَكُوْنُوْا
كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ط

اور اس بنا پر شارع نے اسلام اور اسلامی زندگی کا دوسرا نام جماعت رکھا ہے اور جماعت سے علیحدگی کو "جاہلیۃ اور حیات جاہلی" سے تعبیر کیا ہے۔ جیسا کہ آگے بالتفصیل آئے گا۔

مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ فَمَاتَ مِيْتَةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَغَيْرُ ذَالِكَ اور اسی بنا پر بکثرت احادیث و آثار موجود ہیں جن میں نہایت شدت کے ساتھ ہر مسلمان کو ہر حال میں التزام جماعت اور اطاعت امیر کا حکم دیا گیا۔ اگرچہ امیر غیر مستحق ہو، نا اہل ہو، فاسق ہو، ظالم ہو، کوئی ہو، بشرطیکہ مسلمان ہو اور نماز قائم رکھے مَا اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ اور ساتھ ہی بتلا دیا کہ جس شخص نے جماعت سے علیحدگی کی راہ اختیار کی تو اس نے اپنے تئیں شیطان کے حوالے کر دیا یعنی گمراہی اور ٹھوکر اس کے لئے ضروری ہے۔ زنجیر کا توڑنا مشکل ہوتا ہے لیکن کوئی کڑی زنجیر سے الگ ہو گئی تو ایک چھوٹے سے حلقہ کا حکم رکھتی ہے جس کو انگوٹھے سے مسل دیا!

جاتا ہے، حضرت عمرؓ اپنے خطبوں میں بار بار آنحضرت صلعم سے روایت کرتے۔

عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ فَإِنَّ الشَّيْطَانَ مَعَ الْفَذِّ وَهُوَ مِنَ الْاِثْنَيْنِ الْأَبْعَدُ دوسری آیت میں ہے فَإِنَّ الشَّيْطَانَ مَعَ الْوَاحِدِ یعنی جماعت سے الگ نہ ہو، ہمیشہ جماعت بن کر رہو کیونکہ جب کوئی تنہا اور الگ ہوا تو شیطان اس کا ساتھی ہو گیا۔ دو انسان بھی مل کر رہیں تو شیطان ان سے دور ہے۔ یعنی اتحاد اور جماعتی قوت ان میں پیدا ہو گئی۔ اب وہ راہِ حق سے نہیں بھٹک سکتے۔

یہ الفاظ مشہور خطبہ جابیہ کے ہیں، جو عبداللہ بن دینار، عامر بن سعد، سلیمان بن یسار وغیرہم سے مروی ہے اور بیہقی نے امام شافعی کے طریق سے نقل کیا کہ انہوں نے اجماع کے اثبات اسی روایت سے استدلال کیا۔ اسی طرح حدیث متواتر بالمعنیٰ"

عَلَيْكُمْ بِالسَّوَادِ الْأَعْظَمِ اور فَإِنَّهُ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ اور يَدُ اللهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ اور لَا يَجْمَعُ اللهُ أُمَّتِي عَلَى الضَّلَالَةِ أَوْ كَمَا قَالَ اور خطبہ حضرت امیرکہ وَإِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةَ فَإِنَّ الشَّاذَّ مِنَ النَّاسِ لِلشَّيْطَانِ كَمَا أَنَّ الشَّاذَّ مِنَ الْغَنَمِ لِلذِّئْبِ. أَلَا مَنْ دَعَا إِلَى هٰذَا الشِّعَارِ فَاقْتُلُوهُ وَلَوْ كَانَ تَحْتَ عِمَامَتِي هٰذِهِ. وَغَيْرُ ذٰلِكَ۔ اس بارے میں معلوم و مشہور ہیں، آخری قول و دیگر روایت میں بطریق مرفوع بھی منقول ہے۔ خلاصہ سب کا یہ ہے کہ ہمیشہ جماعت کے ساتھ مل کر رہو، جو جماعت سے الگ ہوا اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے افراد تباہ ہو سکتے ہیں مگر ایک صالح جماعت تباہ نہیں ہو سکتی، اس پر اللہ کا ہاتھ ہے، اللہ کبھی ایسا نہیں ہونے دے گا کہ پوری جماعت گمراہی پر جمع ہو جائے۔

اسی طرح نماز کی جماعت کی نسبت ہر حال میں التزام پر زور دینا اور اگرچہ امام نااہل ہو لیکن سعی قیامِ اہل کے ساتھ التزام جماعت کو بھی جاری رکھنا حتیٰ کہ صَلُّوا خَلْفَ كُلِّ بَرٍّ وَّ فَاجِرٍ تو اس میں بھی یہی حقیقت مضمر ہے کہ زندگی جماعتی زندگی ہے انفراد و فرقت ہر حال میں بربادی و ہلاکت ہے۔ پس جماعت سے کسی حال میں باہر نہ ہونا چاہیئے اور یہی سبب ہے کہ سورۂ فاتحہ میں جو قومی دعا مسلمانوں کو سکھلائی گئی۔ اس میں متکلم واحد نہیں بلکہ جمع ہے حالانکہ وہ دعا فرداً فرداً ہر مومن کی زبان سے نکلنے والی تھی۔ اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ فرمایا۔ "اهْدِنِي" نہیں کہا گیا۔ یہ اس لئے ہے کہ قرآن کے نزدیک، فرد کی ہستی کوئی شی نہیں ہستی صرف اجتماع اور جماعت کی ہے، اور فرد کا وجود اور اعمال بھی صرف اسی لئے ہیں تاکہ ان کے اجتماع کا پیدا ہو اس لئے اس [illegible]

واحد کا اور اسی لئے مسلمانوں کی باہمی ملاقات کے وقت جو تحیّۂ دعا سکھائی گئی ہے جمع آئی ہے' اگرچہ مخاطب واحد ہو یعنی السلام علیک' السلام علیک نہیں قرار دیا گیا' علت اس کی یہی ہے نہ وہ جو لوگوں نے سمجھی ہے اور اسی بنا پر احکام و اعمال شریعت کے ہر گوشے اور ہر شاخ میں یہی اجتماعی و اتلافی حقیقت بطور اصل و اساس کے نظر آتی ہے، نماز کی جماعت خمسہ اور جمعہ و عیدین کا حال ظاہر ہے' حج بجز اجتماع کے اور کچھ نہیں۔ زکوٰۃ کی بنیاد ہی اجتماعی زندگی کا قیام اور ہر فرد کے مال و اندوختہ میں جماعت کا ایک حصہ قرار دیا ہے۔ علاوہ بریں اس کی ادائیگی کا نظام بھی انفرادی حیثیت سے نہیں رکھا گیا۔ بلکہ جماعتی حیثیت سے ہر فرد کو اپنی زکوٰۃ خرچ کر دینے کا اختیار نہیں دیا گیا جیسا کہ بدقسمتی سے

آج مسلمان کر دیتے ہیں، اور جو صریح غیر شرعی طریقہ ہے بلکہ مصارف زکوٰۃ کی رقم
کو خلیفۂ وقت کے سپرد کر دے۔ پس اس کے خرچ کی بھی اصل صورت جماعت
ہے نہ کہ انفرادی۔ یہ امام کا کام ہے کہ اس کا مصرف تجویز کرلے۔ اور مصارف
منصوصہ میں سے جو مصرف زیادہ ضروری ہو اس کا ترجیح دے ہندوستان
میں اگر امام کا وجود نہ بھا تو جس طرح جمعہ وعیدین وغیرہ کا انتظام اس عذر کی بنا
پر کیا گیا زکوٰۃ کا بھی کیا جاتا اور پھر یہ حقیقت کس قدر واضح ہو جاتی ہے، جب ان
تمام مشہور احادیث پر غور کیا جائے جن میں مسلمانوں کی متحدہ قومیت کی تصویر
کھینچی گئی ہے۔

مَثَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَوَادِّهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ الْوَاحِدِ اِذَا اشْتَكٰى
مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعٰى لَهٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى (صحیحین) اور مسلم الْمُسْلِمُ
لِلْمُسْلِمِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهٗ بَعْضًا) بخاری یعنی مسلمانوں کی قومیت
ایسی ہے جیسے ایک جسد یعنی جسم اور اس کے مختلف اعضا ایک عضو میں
درد ہو تو سارا جسم درد محسوس کرتا ہے اور اس کی بے چینی اور تکلیف میں اس
طرح حصہ لیتا ہے جیسے خود اس کے اندر درد اٹھ رہا ہو اور ان کی مثال
دیوار کی سی ہے ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سہارا پاتی اور سہارا دیتی ہے۔
پھر تشبیک اصابع کر کے اس کی تصویر بتلا دی یعنی ایک ہاتھ کی انگلیاں
دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں رکھ کر دکھلا دیا کہ اس طرح ایک دوسرے سے
جڑا ہوا اور متصل ہے۔ سو ان تمام تصریحات میں بھی اسی حقیقت کو واضح کیا
ہے کہ اسلام کی قومیت، متفرق اینٹوں کا نام نہیں ہے دیوار کا نام ہے۔

الگ الگ اینٹ کا کوئی مستقل وجود نہیں تو اجتماعی وجود ہے۔ یعنی دیوار کا ایک جز ہے اور ان اجزاء کے ملنے سے دیوار مشکّل ہوتی ہے۔

اور یاد رہے کہ یہ جو نماز میں تسویہ صفوف پر سخت زور دیا گیا ہے یعنی صف بندی اور سب کے سروں، سینوں، پاؤں کے ایک سیدھ میں ہونے پر لَتُسَوُّنَّ صُفُوْفَکُمْ اَوْ لَیُخَالِفَنَّ اللّٰہُ بَیْنَ وُجُوْھِکُمْ بخاری" اور روایت انس کی.

سَوُّوْا صُفُوْفَکُمْ فَاِنَّ تَسْوِیَۃَ الصُّفُوْفِ مِنْ اِقَامَۃِ الصَّلٰوۃِ (بخاری) وَفِیْ لَفْظٍ مِنْ تَمَامِ الصَّلٰوۃِ تو اس میں بھی یہی بھید ہے۔ اور تشریح کا یہ موقع نہیں ہے، قرآن وسنت کی تصریحات وکمالات اس بارے میں جو محتاج تفسیر وکشف تھیں، کثرت سے ایک ضخیم کتاب جلد منسوب بہ تفسیر البیان میں مفصل لکھ چکا ہوں۔

اس قانون الٰہی کے مطابق مسلمانوں کی قومی زندگی وعروج کا اصل دور وہی تھا جب ان کی قومی وانفرادی، مادی ومعنوی اعتقادی وعمل زندگی پر اجتماع وائتلاف کی رحمت طاری تھی۔ اور ان کے تنزل وادبار کی اصلی بنیاد اس دن پڑی جب اجتماع وائتلاف کی جگہ اشتات وانتشار کی نحوست چھانی شروع ہوگئی۔

ابتداء میں ہر مادہ مجتمع تھا، ہر طاقت سمٹی ہوئی تھی۔ ہر چیز بندھی ہوئی تھی لیکن بتدریج تفرقہ وانتشار کی ایسی ہوا چلی کہ ہر بندھن کھلا، ہر جماؤ پھیلا۔ ہر ملی اور اکٹھی طاقت الگ الگ ہو کر منتشر اور تتر بتر ہوگئی، قرآن کریم کے بتلائے

ہوئے قانونِ تنزلِ اقوام کے مطابق یہ حالت ہر چیز اور گوشۂ وجود عمل پر طاری ہوئی اور ایک ہزار برس پر تین صدیاں گذر چکی ہیں کہ برابر طاری ہو رہی ہے اور بڑھتی جاتی ہے۔ لوگ اسبابِ تنزلِ امت پر بحث کرتے اور پھر طرح طرح کی علتیں ٹھہراتے اور طرح طرح کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں، حالانکہ قرآن و سنت اور عقلیات صحاد قہ کے نزدیک تنزل کے تمام فسادات و نتائج، صرف اسی ایک چیز کا نتیجہ ہیں، اس ایک حقیقت کو کتنے ہی مختلف ناموں سے پکار لو، مگر اصلی علت اس کے سوا کوئی نہیں۔

قوتوں کے انتشار کا دور ساری چیزوں پر طاری ہوا۔ لیکن یہاں صرف ایک پہلو واضح کرنا مقصود ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اسلامی طاقت کی اصلی شخصیت تھی۔

آپ جب دنیا سے تشریف لے گئے تو صرف ایک ہی داعیِ شریعت یا عاملِ وحی کی جگہ خالی نہیں ہوئی بلکہ ان ساری قوتوں، سارے منصبوں، ساری حیثیتوں اور ہر طرح کے نظری و عملی اختیارات و قوٰی کی، جو آپ کی شخصیت مقدسہ میں اکٹھی تھیں، اور جن کا آپ کے تنہا وجود مقدس میں جمع ہونا، اسلام کی شرعی و دینی خصوصیات میں سے تھا۔ اسلام کا داعی، مسیحیت کے مقدس پہاڑی واعظ کی طرح، صرف ایک اخلاقی معلم ہی نہ تھا۔ اور نہ دنیا کے فاتح حکمرانوں کی طرح محض ایک جہانگیر اور عالم ستان شہنشاہ، اسلام نے دین کو دنیا سے اور شریعت کو حکومت و جہانبانی سے الگ نہیں رکھا۔ وہ تو یہ سکھلانے آیا تھا کہ دین و دنیا دو نہیں ایک ہی چیز ہیں۔ اور شریعت سے حکومت و سلطنت الگ نہیں۔ بلکہ سچی حکومت اور خدا کی مرضی کے مطابق سلطنت وہی ہے جس کو شریعت

نے خود پیدا کیا ہو۔ پس اسلام کے داعی کا وجود ایک ہی وقت میں ان تمام حیثیتوں اور منصوبوں کا جامع تھا جو ہمیشہ دنیا کی صدہا مختلف شخصیتوں کے اندر منقسم رہی ہے، وہ اللہ کا پیغمبر تھا۔ شریعت کا مقنن تھا۔ امت کا بانی تھا۔ ملکوں کا حاکم اور سلطنت کا مالک تھا۔ وہ اگر پتوں اور چھال سے پٹی ہوئی مسجد کے منبر پر وحی الٰہی کا ترجمان اور انسانی سعادت و ہدایت کا واعظ تھا۔ تو اسی کے صحن میں یمن کا خراج تقسیم کرنے والا اور فوجوں کو میدان جنگ میں بھیجنے کے لیے سپہ سالار لشکر بھی تھا۔ وہ ایک ہی وقت اور ایک ہی زندگی میں گھروں کا نظام معاشرت درست کرتا۔ اور نکاح و طلاق کے قوانین نافذ کرتا اور ساتھ ہی بدر کے کنارے دشمنوں کا حملہ بھی روکتا۔ اور مکہ کی گھاٹیوں میں سے ایک فاتح حکمراں کی طرح نمایاں بھی ہوتا تھا۔ غرضیکہ اس کی ایک شخصیت کے اندر مختلف حیثیتیں اور منصب جمع تھے۔ اسلام کا نظام دینی یہی تھا کہ یہ ساری قوتیں ایک ہی فرد میں جمع رہیں۔

جب آپ دنیا سے تشریف لے گئے تو خلفائے راشدین کی خلافت اسی اجتماع قوی و مناصب پر قائم ہوئی، اور اس لئے اس کو منہاج نبوت سے تعبیر کیا گیا۔ یعنی یہ نیابت، ٹھیک ٹھیک ہر لحاظ اور ہر پہلو سے شخص جامع نبوت کی سچی قائم مقامی اپنے اندر رکھتی تھی۔

منصب نبوت مختلف اجزائے نظر و عمل سے مرکب ہے۔ ازاں جملہ ایک جزء وحی و تنزیل کا مورد ہونا اور شریعت میں تشریع و تاسیس قوانین کا اختیار رکھنا ہے، یعنی قانون وضع کرنا اور اس کے وضع و قیام کی معصومانہ و غیر مسؤلانہ قوت،

اس جز کے اعتبار سے نبوت آپ کے وجود پر ختم ہو چکی ہے اور قیامت تک کے لئے شریعت وقانون کے وضع وقیام کا معاملہ کامل ہو چکا تھا۔

جب نعمت کامل ہو چکی تو پھر کامل چیز کو ہی ہمیشہ باقی رہنا چاہیئے۔ اس کی جگہ کسی دوسری چیز کا آنا نقص کا ظہور ہوگا نہ کہ تکمیل کا۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الاسلام دینا ط لیکن منصب نبوت اس اصلی جز کے ساتھ بہت سے تبعی اجزاء پر بھی مشتمل تھا۔ اور ضرور تھا کہ ان کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے۔ اس چیز کو مختلف احادیث میں مختلف تعبیرات سے موسوم کیا ہے۔ حضرت عمرؓ کے لئے محدث (بالفتح) کا مقام بتایا گیا۔ علماء کو انبیاء کا وارث کہا گیا۔ مُعَبَّرات صادقہ کو نبوت کا چالیسواں جزء قرار دیا۔

لَمْ يَبْقَ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ حدیث تجدید بھی اس سلسلہ میں داخل ہے۔ پس خلفائے راشدین کو جو نیابت پہنچی۔ اس میں وحی وتشریح کی قائم مقامی تو نہیں ہوسکتی تھی۔ لیکن اور تمام اجزاء وحی وخصائص نبوت کی نیابت داخل تھی۔ داعیِ اسلام کا وجود نبوت کے ساتھ خلافت ارض۔ حکومت وسلطنت، نظام وقوام سیاست، قیادت فوج وحرب، فتح وعمران ریاست، مجالس شوریٰ، وغیرہ جہاں بانی وحکمرانی کے تمام منصب، تنہا اپنی شخصیت کے اندر رکھتا ہے۔ اسی لئے ٹھیک اسی طرح، خلافت خاصہ میں بھی خلفاء راشدین کا تنہا وجود ان ساری نظری وعملی قوتوں اور تمام منصبوں کا جامع ہوا۔ وہ ایک ہی وجود کے اندر صاحب الملت وخلافت بھی تھے۔ صاحب اجتہاد وقضا بھی تھے اور صاحب سیاست ونظم و

احکامِ بلاد بھی۔ اصلاً "امامت کبریٰ" کا مقام اجتہادِ دینی اور سیاستِ ملکی دونوں سے مرکب ہے، اس لئے ان کی امامت میں دونوں قسمیں اپنی تمام شاخوں کے ساتھ اکٹھی تھیں۔

حضرت عمرؓ مسجد کے دار الشوریٰ میں مسائل شرعیہ کا بہ حیثیت ایک مجتہد کے فیصلہ کرتے تھے۔ عدالت میں مقدمے سنتے تھے۔ اور دیوان فوجی میں فوجوں کو تنخواہ بانٹتے تھے۔ اگر وہ نماز جنازہ کی معین تکبیرات پر صحابہ کا اجتماع کرتے تھے۔ تو راتوں کو شہر میں گشت لگا کر احتساب کا فرض بھی ادا کرتے تھے۔ میدان جنگ میں احکام بھی وہی بھیجتے اور روم کے سفیر کو بہ حیثیت شہنشاہِ اسلام، اپنے سامنے بھی وہی بلاتے؟

اسی طرح نبوت کا مقام تعلیم و تربیتِ امت کی قوتوں سے مرکب تھا۔ قرآن حکیم نے ان کو تین اصولی قسموں میں بانٹ دیا۔

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ. وَيُزَكِّيهِمْ. وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

تلاوت آیات، تزکیہ نفوس، تعلیم کتاب و حکمت، خلفائے راشدین، ان تینوں منصبوں میں وجودِ نبوت کے نائب تھے۔ وہ منصب اجتہاد و قضاء شرع کے ساتھ قوتِ ارشاد و تزکیہ نفوس و تربیت بھی رکھتے تھے۔ وہ ایک صاحب وحی کی طرح خدا کے کلام کی منادی کرتے۔ ایک نبی کی طرح، تعلیم و کتاب اور حکمت و سنت سے امت کی تربیت و پرورش کرنے والے تھے۔

وہ ایک ہی وجود میں ابو حنیفہؒ و شافعیؒ بھی تھے۔ اور جنیدؒ و شبلیؒ بھی و نخعی و حماد بھی تھے۔ اور ابن معین و ابن راہویہ بھی، جنہوں کا نظام بھی انہی

کے ہاتھ تھا۔ دلوں کی حکمرانی بھی انہی کے قبضہ میں تھی۔ یہی حقیقت اور کامل معنی، منصب نبوت کی نیابت کے ہیں، اور اسی لئے ان کا وجود اور ان کے اعمال بھی، اعمال نبوت کا ایک آخری جزء تھے کہ

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ" اور اسی لئے "عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ" کے حکم میں نہ صرف سنتِ عہدِ نبوت، بلکہ خلافت راشدہ و خاصہ کی سنت بھی داخل ہوئی اور شرحِ اس سرِّ الٰہی کی بہت طولانی ہے، یہاں محض اشارت مطلوب!

لیکن جیسا کہ پہلے سے خبر دے دی گئی تھی۔ اجتماع و استلاف کی یہ حالت، حضرت علیؓ پر ختم ہو گئی۔ اس کے بعد سے اشتات و انتشار کا دور شروع ہوا، ازاں جملہ مرکزی قوتوں اور منصبوں کا انتشار و اشتات تھا۔ جس نے فی الحقیقت امت کا تمام نظام شرعی واصلی درہم برہم کر دیا۔ خلافت خاصہ کے بعد یہ ساری یک جا قوتیں الگ الگ ہو گئیں، ایک وجود کی جگہ مختلف وجودوں میں، ان کا ظہور اور نشو و نما ہوا۔ حکومت و فرمانروائی کا ٹکڑا الگ ہو کر، مجرد پادشاہی کی شکل میں آگیا۔ اسی کی طرف اشارہ تھا۔ اَلْخِلَافَةُ بَعْدِي ثَلَاثُوْنَ سَنَةً ثُمَّ مُلْكٌ ط سو واقعی اس کے بعض صرف پادشاہی ہی رہ گئی، اجتہاد اور قضاء شرعی کا جزء خلافت سے الگ ہوا تو مجتہدین و فقہا کی ایک جماعت پیدا ہو گئی۔ انہوں نے یہ کام سنبھالا، اسی طرح تعلیم و تربیتِ روحانی کے کاروبار سے نظام حکومت بالکل الگ ہو گیا۔ پہلے خلافت کی ایک ہی بیعت تمام مقاصد کی کفیل تھی۔ اب خلیفہ کا وجود محض پادشاہی کے لئے اور فقہا کا، مجرد استنباط احکام و مسائل کے لئے رہ گئے، تو

تزکیۂ نفوس اور ارشادِ قلوب کے لئے "ایک دوسری بیعت مستقلاً قائم ہوئی" جو بیعتِ توبہ و ارشاد ہوئی اور اس طرح اصحاب طریقت و تصوف کی بنیاد پڑی، پہلے صرف ایک وجود تھا وہ پادشاہ مجتہد، مرشد، قاضی القضاء سپہ سالار جنگ میر عدل و احتساب سب کچھ تھا۔ اب یہ ساری قوتیں الگ الگ ہو گئیں، حکومت فرمانروا' الگ الگ وجود میں آئی۔ اجتہاد اور تفقہ کے لئے دوسرا وجود مرکزہی فضا کے لئے تیسرا، ارشاد و تزکیۂ قلوب کے لئے چوتھا۔ وھلم جرا غرضیکہ عہد اجتماع قوائی و مناصب کے بعد دور انتشاری قوائی و مناصب، شروع ہو کر رفتہ رفتہ کمال ظہور و بلوغ تک پہنچ گیا۔ حتیٰ کہ یہ تمام قوتیں اس طرح ایک دوسرے سے بیگانہ و مخالف ہو گئیں کہ یا تو ایک ہی وجود میں جمع تھیں* یا اب مختلف وجودوں میں بٹ کر بھی متفق نہ رہ سکیں۔ صرف اختلاف، تعداد و تنوع میں نہیں رہا بلکہ اختلاف تضاد کی شکل پیدا ہو گئی۔ یہی سبب سے بڑی مصیبت و ہلاکت تھی جو امت پر طاری ہوئی۔

مسلمانوں کے تنزل و ادبار کی اصلی علت یہ ہے وہ افسانے نہیں ہیں۔ جن میں تم سرمست ہو، افسوس کہ سطحی و جزوی حالات کے استغراق نے اصلی اسباب و علل پر غور کرنے کی تمہیں کبھی مہلت نہ دی، اور بحث و نظر میں یورپ کی تقلید سے آزاد نہ ہو سکے۔ کہ خالص اسلامی فکر و نظر سے اسباب ترقی و تنزل پر تدبر کرتے۔

غرضیکہ خلافت راشدہ کے بعد جو سلسلۂ خلافت قائم ہوا۔ خواہ وہ قرشی رہا ہو یا غیر قرشی "محض ملوکی و پادشاہی کا سلسلہ تھا۔ اور بجز چند مستثنیٰ اوقات،

کے۔ جیساکہ عہد حضرت عمر بن عبدالعزیز یہ نہایت ثبوت کے اور تمام اجزاء سے یک قلم خالی رہا۔ منصب بٹ چکے تھے۔ قوتیں منتشر ہو چکی تھیں، البتہ جو انقلاب سلطان عبدالحمید خاں کے زمانہ میں ہوا اور جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلاطین عثمانیہ کی خلافت طریق استبدادی و شخصی سے طریق شوریٰ میں تبدیل ہو گئی سو بلاشبہ یہ خلافت راشدہ کی طرف عود و رجعت کا ایک یہ مبارک قدم تھا جس کے لئے شوریٰ اور پارلیمنٹ کا ہونا سب سے پہلی شرط ہے۔ لیکن ان جزئی مستثنیات کے علاوہ تمام حالات و خصائص ہر دور اور سلسلے کے وہی رہے جو ایک جامع لفظ "سلاسل مصنوعی" میں بتا دیئے گئے تھے۔ اور اس میں بھی کبھی کوئی نمایاں اور پائیدار تبدیلی نہ ہوئی۔ لیکن یہاں اس بات کا لحاظ ضروری ہے کہ قومی ترقی و فلاح کے لئے، جماعت کی تشکیل میں پانچ مرتبہ کا لحاظ ضروری ہوگا یعنی اجتماع، اتحاد، ائتلاف، امتزاج، انتظام یہ پانچ عناصر ہیں، جو ہر قومی تنظیم کے لئے ضروری ہیں، اور ان میں ترتیب فطری طور پر یہی ہوگی جو یہاں ذکر ہے۔ سب سے پہلے درجہ اجتماع ہوگا۔ پھر اتحاد۔ پھر ائتلاف۔ اس کے بعد امتزاج اور سب کے آخر میں انتظام ہوگا۔ جس قوم نے یہ پانچ مراتب طے کر لئے تو سمجھو کہ اس نے عروج و ارتقاء فلاح و کامرانی کی سب منزلیں طے کر لیں۔ اب اس کے لئے منزل مقصود تک پہنچنا مشکل نہیں۔

جماعت سے مقصود یہ ہے کہ افراد کا ایک ایسا مجموعہ ہو جس میں اتحاد امتزاج اور نظم ہو۔ اتحاد سے مقصود یہ ہے کہ اپنے اعمال و حیات میں منتشر نہ ہوں۔ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں اور ان کے تمام اعمال کا مرجع کل کا انجام

پائیں، کسی گوشۂ عمل میں بھی پھوٹ اور بیگانگی نہ ہو۔ ائتلاف کا مرتبہ اتحاد سے بلند تر ہے۔ اتحاد صرف باہم مل جانا ہے، ضرور نہیں کہ کسی تناسب کے ساتھ ترکیب ہوئی ہو، لیکن ائتلاف سے مقصد ایسا اتحاد ہے جو محض اتحاد ہی نہ ہو بلکہ ایک صحیح و مناسب ترکیب کے ساتھ اتحاد ہو، یعنی منتشر افراد اس طرح باہم ملے ہوں کہ، جس فرد کو اس کی صلاحیت و قوت کے مطابق جو جگہ ملنی چاہیئے وہی جگہ اسے ملی ہو۔

ہر فرد کی انفرادی قوت کو جماعتی ترکیب میں اتنا ہی دخل دیا جائے جتنی مقدار میں دخل پانے کی اس میں استعداد ہے، ایسا نہ ہو کہ زید کو سردار بنانا چاہیئے۔ اور اس سے چاکری کا کام لیا جائے اور عمر کی قابلیت کا عنصر چھٹانک بھر جزو جماعت ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کو سیر بھر قرار دے دیا جائے۔

امتزاج۔ ترکیب کا تیسرا درجہ ہے اس میں کمیت سے، کیفیت حاصل کر سکتا ہے، ویسا ہی مزاج اس کے ساتھ ملایا جائے۔ یہ نہ ہو کہ دو ایسے آدمیوں کو ملا دیا گیا، جن کی طبیعت رخصت اور استعداد و صلاحیت باہم گر میل نہیں کھا سکتی اور اس لئے خواہ کتنا ہی دونوں کو ملاؤ لیکن تیل اور پانی کی طرح ہمیشہ الگ الگ ہی نظر آئیں۔ باہم مل جل کر ایک جان نہ ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ نے جس طرح عناصر کو اس لئے پیدا کیا ہے، کہ باہم گر مل کر ایک نئے مرکب وجود میں منتقل ہوں۔ افراد انسانی کو بھی اسی لئے پیدا کیا ہے، تاکہ ان کے باہم ملنے سے جماعت پیدا ہو، جماعت ایک مرکب وجود ہے۔

افراد اس کے عناصر ہیں، فرد بجائے خود کوئی کامل وجود نہیں رکھتا۔ محض ایک شئی ہے اور جب تک اپنے بقیہ ٹکڑوں سے مل نہ جائے۔ کامل وجود نہیں پا سکتا۔ لیکن یہ باہم ملنا۔ امتزاج کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ تاکہ ہر ٹکڑا اپنے صحیح و مناسب ٹکڑے کے ساتھ مل کر اس طرح جڑ جائے کہ معلوم ہو۔ یہ نگینہ اسی انگشتری کے لئے تھا" نظم سے مقصود جماعت کی وہ ترتیبی و تقویمی حالت ہے۔ جب اس کے تمام افراد اپنی اپنی جگہوں میں قائم۔ اپنے اپنے دائرہ میں محدود اور اپنے اپنے فرائض و اعمال کے انجام دینے میں سرگرم ہوں۔

مرکزیتِ قومیہ

اس کے بعد سب سے اہم مسئلہ اتباع خلیفہ کا ہے۔ خلیفہ خلف سے ہے۔ خلف کے معنی جانشینی اور قائم مقامی کے ہیں، خواہ یہ نیابت و جانشینی امورِ حسنہ میں ہو یا افعالِ قبیحہ میں، ہر صورت میں خلافت اور نیابت ہے۔ بنی نوع انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیفہ فرمایا ہے۔ کیونکہ انسان بھی اپنے افعال و احوال تکوینیہ اور افعال و کیفیاتِ طبعیہ میں اپنے خالق کا قائم مقام اور جانشین ہے۔ ایسے ہی امورِ شرعیہ اور معاملاتِ تشریعیہ میں اس کی قائم مقامی اور جانشینی اس طرح ہوگی۔ کہ نظامِ عدل اور قانونِ انصاف کو اپنے شہنشاہِ حقیقی کی جانب سے نافذ اور جاری کرنے کا حق اس کو ہوگا۔

ارضی کا نام ہے جو کوئی اقتدار سماوی نہیں جس کے پاس ارضی اور زمینی حکومت و اقتدار ہے وہ خلیفہ ہے ورنہ نہیں اس اجمالی تمہید

کے بعد سب سے زیادہ اہم مسئلہ سامنے آتا ہے، یعنی اسلام کا وہ نظام شرعی جو ہر مسلمان کو خلیفۂ وقت کی معرفت اور اطاعت پر اسی طرح مجبور کرتا ہے جس طرح اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف کوئی حکم نہ دے۔ اسلام کا قانون اس بارے میں اپنی تمام شاخوں اور تعلیموں کی طرح فی الحقیقت کائنات ہستی کے قدرتی نظام کا ایک جزو اور اقوام ہستی کی زنجیر فطرت کی ایک قدرتی کڑی ہے۔ کائنات کے ہر حصہ اور ہر گوشہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کی قدرت و سنت ایک خاص نظام پر کار فرما ہے جس کو قانون مرکز یا قانون دوائر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یعنی قدرت نے خلقت و نظام خلقت کے بقا و قیام کے لیے ہر جگہ اور ہر شاخ وجود میں یہ صورت اختیار کر رکھی ہے کہ کوئی ایک وجود تو بمنزلہ مرکز کے ہوتا ہے اور بقیہ اجسام ایک دائرے کی شکل میں اس کے چاروں طرف وجود پاتے ہیں۔ اور پورے دائرے کی زندگی اور بقا صرف اس مرکزی وجود کی زندگی اور بقا پر موقوف ہوتی ہے۔ اگر ایک چشم زدن کے لیے بھی دائرہ کے اجسام اپنے مرکز سے الگ ہو جائیں یا مرکز کی اطاعت و انقیاد سے باہر ہو جائیں۔ تو تمام نظام ہستی درہم برہم ہو جائے اور دائرہ کی اکیلی ہستیاں، مرکز سے الگ رہ کر کبھی قائم و باقی نہ رہ سکیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو بعض اصحاب اشارات نے یوں تعبیر کیا ہے کہ الحقیقۃ کالکرۃ اور اصحاب فتوحات نے کہا کہ دائرۂ قاب قوسین ہے۔

یہ قانون مرکزیت و دوائر نظام ہستی کے ہر جز اور ہر حصہ میں صاف صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ نظام شمسی جو ہمارے اوپر ہے۔ ستاروں کی گنجان

آبادی ۔ کروں کا یہ صحرائے بے کنار زندگی اور حرکت کا یہ محیر العقول طلسم کیا ہے؟ کس نظام پر یہ پورا کارخانہ چل رہا ہے ۔ اس قانون مرکزیت پر متحرک سیاروں کے حلقہ اور دائرے ہیں ۔ ہر دائرہ کا نقطۂ حیات و بقا سورج کا مرکزی نقطہ ہے تمام سیارے اپنے اپنے کعبہ مرکز کا طواف کر رہے ہیں ۔ اور ہر دائرہ کی ساری زندگی اور بقا ، مرکز شمس کی اطاعت و انقیاد پر موقوف ہے ۔ ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ط خود ہماری زندگی بھی ایک ایسے ہی دائرہ کی ایک کڑی ہے اور شب و روز اپنے مرکز کے طواف و انقیاد میں مشغول ہے ۔

ہر ستارے کے طواف و دوران کے لئے ، حکمت الٰہی نے ایک خاص راہ اور ایک خاص زمانہ قرار دے دیا ہے ۔ وہ اس سے باہر نہیں جا سکتا سب محکم ۔ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ط أَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ ط خدا کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق اپنی اپنی جگہ میں کام کر رہے ہیں ۔ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ط

قانون مرکزیت کا یہ پہلا اور بلند ترین نظارہ تھا ۔ اب اس کے بعد جس قدر نیچے اترتے آئیں گے اور حرکت و حیات کی بلندیوں سے لے کر زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے گوشوں تک نظر ڈالیں گے ۔ ہر جگہ زندگی اور بقا اس قانون سے وابستہ نظر آئے گی ۔ عالم نباتات میں درخت کو دیکھو ۔ اس کی ایک مجتمع وحدت ، کتنی وسیع کثرت سے مرکب ہے ۔ ڈالیاں ہیں ، شاخیں ہیں ، پتے ہیں ، پھول ہیں ، لیکن سب کی زندگی ایک ہی مرکز یعنی جڑ سے وابستہ ہے ۔

جڑ سے کوئی شاخ الگ ہوئی کہ موت و فنا اس پر طاری ہو گئی۔ آفاق کو چھوڑ کر عالم انفس کی طرف آؤ۔ اور خود اپنے وجود کو دیکھو، جس کے دیکھنے کے لئے نظر اٹھانے کی بھی ضرورت نہیں۔ تمہارا وجود کتنے مختلف ظاہری و باطنی اعضاء سے مرکب ہے جسموں اور وجود کی ایک پوری بستی ہے جو تم میں آباد ہے۔ ہر جسم کا ایک فعل ہے۔ اور ایک خاصہ، لیکن دیکھو یہ ساری آبادی کس طرح ایک ہی مرکز کے آگے سربسجدہ ہے۔

سب کی حیات کا مرکز صرف قلب ہے۔ اس سے الگ رہ کر ایک عضو بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اذا صلحت صلحت کلھا۔ واذا فسدت فسدت کلھا۔ اسلام فی الحقیقت سنت اللہ اور فطرت اللہ ہی کا دوسرا نام ہے۔ اگر نوع انسانی کی سعادت و ارتقا کے لئے، قانون اسلام اسی فاطر السموٰت و الارض کا بنایا ہوا ہے جس نے تمام کائنات کے لئے قانون حیات بنایا۔ تو ضرور ہے کہ دونوں میں اختلاف نہ ہو، بلکہ پہلا قانون، پچھلے قانون عام کا ایک ایسا قدرتی جزء نظر آئے۔ جیسے زنجیر کی ایک کڑی۔

پس اسلام کا نظام شرعی بھی ٹھیک اسی قانون مرکزیت پر قائم ہوا۔ قرآن نے یہ حقیقت جا بجا واضح کی ہے کہ جس طرح اجسام و اشیاء کی زندگی اپنے مرکزوں سے وابستہ ہے۔ اسی طرح نوع انسانی اور اس کی جماعت و افراد کا جسمانی و معنوی بقا بھی قانون مرکزیت پر موقوف ہے۔ جس طرح ستاروں کی زندگی اور حرکت کا مرکز و محور سورج کا وجود ہے، اسی طرح نوع انسانی کا بھی مرکز سعادت، انبیاء کرام کا وجود ہے۔ پس ان کی اطاعت و انقیاد بقاء حیات

کے لئے ناگزیر ٹھہری۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ط

دنیا میں کوئی نبی نہیں آیا مگر اس لئے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور اسی لئے فرمایا۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ط اور لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ط پھر قوم وملت کی بقا کے لئے ہر طرح کے دائرے اور ہر طرح کے مرکز قرار دیئے۔ اعتقاد میں اصلی مرکز عقیدہ توحید کو ٹھہرایا۔ جس کے گرد تمام عقائد کا دائرہ قائم ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ

عبادت میں نماز کو مرکز عمل ٹھہرایا جس کے ترک کر دینے کے بعد تمام دائرہ اعمال منہدم ہو جاتا ہے۔

فَمَنْ اَقَامَهَا اَقَامَ الدِّيْنَ وَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ هَدَمَ الدِّيْنَ اور اسی لئے یہ بات ہوئی کہ كَانَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ لَا يَرَوْنَ شَيْئًا مِّنَ الْاَعْمَالِ تَرْكُهٗ كُفْرٌ غَيْرَ الصَّلٰوةِ (ترمذی) یعنی صحابہ کرامؓ کسی عمل کے ترک کر دینے کو کفر نہیں سمجھتے تھے۔ مگر نماز کے ترک کو۔ اسی طرح تمام قوموں اور ملکوں کا ارضی مرکز سعادت وادیٔ حجاز کا کعبۃ اللہ قرار پایا۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ ط

پر غور کرو۔ اور چونکہ یہ مرکز ٹھہرا۔ اس لئے تمام دائرہ کا رخ بھی اس طرف ہوا۔ خواہ دنیا کی کسی جہت میں مسلمان ہوں۔ لیکن ان کا مرکز اس طرف ہونا چاہیئے۔

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ پس جس طرح شخصی و اعتقادی اور عملی زندگی کے لئے مراکز قرار پائے۔ ضرور تھا کہ جماعتی اور ملی زندگی کے لئے بھی ایک مرکزی وجود قرار پاتا۔ لہٰذا وہ مرکز بھی قرار دے دیا گیا۔ تمام امت کو اس مرکز کے گرد بطور دائرہ کے ٹھہرایا۔ اس کی معیت اس کی اطاعت اس کی حرکت پر حرکت اس کے سکون پر سکون اس کی طلب پر لبیک۔ اس کی دعوت پر انفاق جان و مال ہر مسلمان کے لئے فرض کر دیا گیا۔ ایسا فرض جس کے بغیر وہ جاہلیت کی ظلمت سے نکل کر اسلامی زندگی کی روشنی میں نہیں آسکتا۔ اسلام کی اصطلاح میں اس قومی مرکز کا نام خلیفہ اور امام ہے۔ اور جب تک یہ مرکز اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا ہے یعنی کتاب و سنت کے مطابق اس کا حکم ہے۔ ہر مسلمان پر اس کی اطاعت و اعانت اسی طرح فرض ہے جس طرح خود اللہ اور اس کے رسول کی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّأَحْسَنُ تَأْوِيْلًا ؕ

مسلمانو! اطاعت کرو اللہ کی، اس کے رسول کی۔ اور تم میں جو اولامر ہو اس کی بھی اگر کسی معاملہ میں تم مختلف ہو جاؤ تو چاہیئے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹو اور اس کے فیصلہ پر متفق ہو جاؤ۔

اس آیت میں بالترتیب تین اطاعتوں کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ کی، رسول

کی، مسلمانوں میں جو اولوالامر ہو اس کی۔ اللہ کی اطاعت، کتاب اللہ کی اطاعت ہے۔ رسول کی اطاعت سے مقصود سنت قول و فعل ہے۔ باقی رہی اطاعت اولوالامر تو نہایت قوی و روشن وجوہ موجود ہیں کہ اولوالامر سے مقصود مسلمانوں کا خلیفہ و امام ہے۔ جو کتاب و سنت کے احکام نافذ کرنے والا۔ نظام امت قائم رکھنے والا۔ اور تمام اجتہادی امور میں صاحب حکم و سلطان ہے۔

اولاً بحکم "اَلْقُرْآنُ یُفَسِّرُ بَعْضُہٗ بَعْضًا" اولوالامر کی تفسیر خود قرآن ہی کے اندر تلاش کرنی چاہیے۔ اسی سورت میں آگے چل کر یہ لفظ دوبارہ آیا ہے۔

اِذَا جَآءَھُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِالْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِہٖ وَلَوْ رَدُّوْہُ اِلَی الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓی اُولِی الْاَمْرِ مِنْھُمْ لَعَلِمَہُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَہٗ مِنْھُمْ ط

اور جب کوئی امن یا خوف کی خبر ان تک پہنچتی ہے تو بلا سوچے سمجھے لوگوں میں پھیلا دیتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ اللہ کے رسول کی طرف اور ان لوگوں کی طرف رجوع کرتے جو ان میں اولوالامر ہیں تو فوراً اصلیت کھل جاتی اور وہ اس خبر کے سچے جھوٹے ہونے کا پتہ لگا لیتے۔

اس آیت میں ایسے وقتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب امن و خوف یعنی صلح و جنگ اور فتح و شکست کی افواہیں ملک میں پھیلتی ہیں۔ اور بے اصل خبروں کی اشاعت سے لوگوں میں اضطراب و غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسی صورتیں منافقین اور بعض ضعیف القلب مسلمانوں کی وجہ سے عہد نبوی میں بھی پیش آ جاتی تھیں۔ پس فرمایا کہ جب کوئی افواہ سنو تو پہلے اللہ کے رسول اور اولوالامر

تک پہنچاؤ۔ تاکہ وہ اس کی صحت اور عدم صحت کی تحقیق کریں اور خبر کی نوعیت اور راویوں کی حالت پر غور کر کے صحیح نتائج کا استنباط کریں۔ ایسا نہ کرو کہ جہاں کوئی افواہ سنی فوراً اس پر یقین کر لیا۔ اور لوگوں میں پھیلانا شروع کر دیا۔

اب غور کرنا چاہیے کہ اس آیت میں اولوالامر سے مقصود کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ذکر جس امن و خوف کے حالات کا ہے۔ یعنی صلح و جنگ اور فتح و شکست کا، ان حالات کا تعلق صرف حکام و امرا ملک ہی سے ہو سکتا ہے۔ علماء و فقہا سے نہیں ہو سکتا۔ معاملہ نظم ملک و قیام امن کا ہے۔ استنباط مسائل اور حلال و حرام کا نہیں ہے۔ پس لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اولوالامر سے مقصود وہی لوگ ہیں، جن کے سپرد ملک کا انتظام اور جنگ، و امن کا نظم و نسق ہوتا ہے اور جو ان خبروں کی تحقیق کر سکتے ہیں، جن کا اثر ملک کے امن و خوف پر پڑ سکتا ہے۔ یعنی ارباب حکومت و امارت۔

ثانیاً۔ کتاب و سنت اور صدر اول کے آثار عربیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "امر" جب ایسی ترکیب کے ساتھ بولا جائے۔ جیسی کہ یہاں ہے تو اس کا اطلاق عموماً حکومت و سلطنت ہی کے معنوں پر ہوتا ہے۔ احادیث میں یہ استعمال کثرت سے موجود ہے کہ ایک صاحب نظر کے لئے کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں۔ نیز لغت کی بنا پر بھی ظاہر ہے کہ "امر" کے معنی حکم کے ہیں۔ اور اولی الامر کے معنی امام بخاریؒ نے ذوی الامر کے کئے ہیں۔ یعنی حکم والا۔ اور معلوم ہوا کہ صاحب حکم وہی ہو سکتا ہے جو صاحب حکومت ہو۔

ثالثاً۔ احادیث صحیح سے ثابت ہے کہ خود یہ آیت جس واقعہ کی نسبت اتری وہ امیر جماعت کی اطاعت ہی کا معاملہ تھا۔ بخاری و مسلم میں ہے۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ نَزَلَتْ فِي عَبْدِ اللهِ بْنِ حُذَافَةَ بْنِ قَيْسِ بْنِ عَدِيٍّ إِذْ بَعَثَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَرِيَّةٍ اور امام طبری نے تفسیر میں ایک روایت درج کی ہے کہ عمار بن یاسر اور خالد بن ولید کی باہمی نزاع کے بارے میں اتری۔ خالد امیر تھے اور عمار نے بلا ان کے حکم کے ایک شخص کو مزدوری پر رکھ لیا تھا۔ نَزَلَتْ فِي قِصَّةٍ جَرَتْ لِعَمَّارٍ مَعَ خَالِدٍ وَكَانَ خَالِدٌ أَمِيرًا فَأَجَارَ عَمَّارٌ رَجُلًا بِغَيْرِ أَمْرِهِ فَتَخَاصَمَا ط دونوں روایتوں میں ثابت ہوتا ہے کہ معاملہ امیر کی اطاعت و عدم اطاعت کا تھا نہ کہ احکام و مسائل کے حکم و افتاء کا۔

رابعاً۔ اکثر اقوال مرویہ صحابہ و تابعین سے بھی یہی تفسیر ہوتی ہے۔ بلکہ صدر اول میں صرف تفسیر مشہور و معلوم تھی۔ بہت سی موشگافیاں جو پیدا کی گئی ہیں، سب بعد کے مفسرین کی طبع زاد ہیں۔ حافظ ابن حجر نے ابن عیینہ کا قول نقل کیا ہے۔

سَأَلْتُ زَيْدَ بْنَ أَسْلَمَ عَنْهَا وَلَمْ يَكُنْ بِالْمَدِينَةِ أَحَدٌ يُفَسِّرُ الْقُرْآنَ بَعْدَ مُحَمَّدِ بْنِ كَعْبٍ مِثْلَهُ فَقَالَ اقْرَأْ مَا قَبْلَهَا اقْرَأْ فَقَرَأْتُ إِنَّ اللهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ۔ فَقَالَ هٰذِهِ فِي الْوُلَاةِ۔

یعنی مدینہ میں محمد بن کعب کے بعد زید بن سلم سے بڑھ کر قرآن کا کوئی مفسر نہ تھا۔ میں نے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اس آیت سے ماقبل کی آیت پڑھو۔ میں نے پڑھا۔ اِنَّ اللہَ یَأْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ ط پس کہا کہ مقصود اس سے احکام ہیں۔ یعنی چونکہ پہلے سے ذکر حکومت و قضا کا ہو رہا ہے پس اولوالامر سے مقصود وہی ارباب اقتدار ہیں جو حکومت رکھتے ہوں۔ طبری نے بسند صحیح حضرت ابوہریرہ اور میمون بن مہران وغیرہ سے نقل کیا ہے "ھُمُ الْاُمَرَاءُ" اور علامہ ابن حزم نے ان تمام صحابہ و تابعین کو شمار کیا جن سے یہ تفسیر منقول ہے تو ۱۳ سے زیادہ ثابت ہوئے۔

باقی رہا بعض صحابہ و تابعین کا یہ کہنا کہ اولوالامر سے مقصود اہل علم اور اصحاب نظر ہیں۔ مثلاً جابر بن عبداللہؓ کا قول کہ ھُمْ اَھْلُ الْعِلْمِ وَالْخَیْرِ اور مجاہد و عطاء و ابوالعالیہ کا قول کہ ھُمُ الْعُلَمَاءُ تو ان اقوال میں اور اصحاب کی مشہور تفسیر میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ دراصل اسلام کا نظام حکومت و جماعت تو یہی تھا کہ حکومت و ولایت کا منصب تمام علمی و عملی قوتوں سے مرکب ہو۔ اور اس وقت تک قوتوں کے انتشار اور مناصب کے تفرقہ کی بنیاد نہیں پڑی تھی۔ پس جو شخص والی ملک اور حاکم مسلمین ہوتا تھا وہ بدرجہ اولیٰ عالم و فقیہ بھی ہوتا تھا۔ پس جن صحابہ و تابعین نے اولوالامر کی تفسیر میں علم و خیر کا ذکر کیا ہے تو انہوں نے معنی کی [illegible] تفسیر کی گویا ظاہر کر دیا کہ مسلمانوں کا اولوالامر ایسے ہی افراد

کو ہونا چاہیے۔ جو اہل علم و خبر ہوں۔ مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ اولوالامر سے مقصود علماء و فقہا کا مخصوص گروہ ہے جو اسلام کی جماعت کے افتراق کے بعد پیدا ہوا اور جس کا صدر اول کے مفسرین کو وہم و گمان بھی نہ ہوا ہوگا۔ امام ابن جریرؒ نے عکرمہ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ اولوالامر سے مراد ابوبکر و عمر ہیں۔ اس سے بھی ان کا مقصود یہی ہے کہ اولوالامر مسلمانوں کا خلیفہ و امام ہے۔ جیسے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما۔

اصل یہ ہے کہ قرآن و سنت ایک قانون ہے لیکن قانون بالکل بیکار ہے۔ اگر کوئی قوتِ نافذہ نہ ہو۔ یعنی اس قانون پر عمل کرانے والی قوت۔ اور ظاہر ہے کہ جو قوت نافذہ ہوگی اس کی اطاعت میں قوتِ مقننہ کی اطاعت ہوگی۔ ایک دیہاتی تک جانتا ہے کہ گورنر اور نائب السلطنت کی اطاعت عین بادشاہ کی اطاعت ہے بلکہ ایک سپاہی کی اطاعت بھی عین بادشاہ اور قانون کی اطاعت ہے اور اس سے مقابلہ کرنا عین بادشاہ اور قانون سے بغاوت کرنا ہے۔ یہ ساری بحثیں اس لئے پیدا ہوئیں کہ اسلام کے جماعتی نظام کی اہمیت پر نظر نہ گئی۔ اگر یہ حقیقت پیش نظر ہوتی کہ شریعت کا نفاذ اور امت کے نظام و انضمام کے لئے ایک مرکزی اقتدار ضروری ہے اور وہی امام اور اس کا نائب اور امراء ہیں۔ تو اولوالامر کا مطلب بالکل صاف تھا۔ کسی کاوش و بحث کی ضرورت ہی نہ تھی۔

فان تنازعتم الخ سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ اسلامی خلیفہ کا وجود مسیحی پوپ سے کس درجہ مختلف ہے جو اسلام کے نزدیک

اربابا من دون اللہ میں داخل ہے مسیحیت کا خلیفہ دراصل ارضی خلیفہ نہیں بلکہ آسمانی فرمانروا ہے جو مذہب کی آخری طاقت اپنے قبضہ میں رکھتا ہے۔ لیکن اسلامی خلافت ارضی یعنی حکومت وسلطنت ہے۔ وہ صرف شریعت وامت کا حفاظت کرنے والا اور احکام شریعت نافذ کرنے والا ہے یعنی محض ایک قوتِ نافذہ ہے نہ کہ مقننہ' اس کی ذات کو اصل شریعت اور اس کے احکام میں کوئی دخل نہیں۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو ردوہ الی اللہ والرسول نہ فرمایا جاتا۔ یعنی اگر کوئی ایسی صورت پیش آجائے کہ جس میں نزاع واختلاف پیدا ہو تو پھر اس کے آخری فیصلہ کی طاقت خلیفہ کا حکم نہیں، بلکہ اولی ومحورِ حقیقی کو حق ہے کہ فیصلہ کریں یعنی قرآن وسنت کو فیصل مانا جائے گا۔ اور قوت فیصلہ ان کو حاصل ہوگی۔ اور خود خلیفہ بھی اس مرکز کی اطاعت کے لئے مجبور ہے۔ جسطرح جماعت، اور امت کا ایک فرد یہی وجہ ہے۔ اطیعوا اللہ کے بعد اطیعوا الرسول کا اعادہ کیا گیا مگر اولوالامر میں نہیں کیا گیا۔ یعنی وہاں اطیعو اولی الامر نہیں فرمایا بلکہ اولوالامر اور فعل کو ترک کردیا گیا۔ تاکہ واضح ہوجائے کہ اصل اطاعت جو مطلوب ہے۔ وہ صرف اللہ کی ہے اور اس کے رسول کی یعنی کتاب وسنت کی اور اولوالامر کی اطاعت۔ صرف اس لئے ہے تاکہ کتاب وسنت کی اطاعت کی جائے بالاستقلال نہیں ہے پھر فان تنازعتم کہہ کر زیادہ واضح کردیا کہ اولوالامر کتاب وسنت کے خلاف کو حکم دیں، تو پھر اس حکم میں ان کی اطاعت نہیں ہے بلکہ اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف

لوٹتا ہو گا یعنی کتاب و سنت کی جانب۔ غرضیکہ اس آیت کریمہ میں قرآن نے اس قانون شریعت کا اعلان کیا ہے کہ خلیفہ و امام کی اطاعت مسلمانوں پر فرض ہے اور اس کا وجود نظام جماعت کے مرکزی اقتدار کا مالک۔ کیونکہ کسی جماعت کی جماعتی زندگی بغیر کسی مرکزی قوت کے ناممکن ہے۔ تم پانچ آدمیوں کی بھی کوئی مجلس منعقد کرتے ہو۔ تو سب سے پہلے ایک پریزیڈنٹ کا انتخاب کرتے ہو کہ جب تک کسی کو صدر نہ مان لیں گے، یہ پانچ آدمیوں کی مجلس بھی کوئی صحیح کام نہ کر سکے گی۔ فوج ترتیب دیتے ہوئے تو دس آدمیوں کو بھی بغیر ایک افسر کے نہیں چھوڑتے۔ اور اس کی اطاعت ماتحتوں کے لیے فرض سمجھتے ہو۔ اور یقین کرتے ہو کہ بغیر اس کے فوج کا نظام باقی نہیں رہ سکتا۔ پانچ دس آدمی بھی اگر بغیر امیر کے کام نہیں کر سکتے تو قومیں کیونکر بلا امیر اپنے فرائض انجام دے سکتی ہیں۔ اس سے بھی سادہ تر مثال یہ ہے کہ اپنے اپنے گھروں اور خاندانوں کو دیکھو، خود تمہارا گھر بھی ایک چھوٹی سی آبادی ہے۔ اگر بیوی تمہارا حکم نہ مانے تو تم کیوں بگڑتے ہو۔ اگر گھر کے لوگ تمہارے کہنے پر نہ چلیں تو تم کیوں لڑتے ہو، تم کہتے ہو کہ فلاں گھر میں امن و انتظام نہیں، روزانہ خانہ جنگی ہوتی رہتی ہے۔

یہ سب کچھ کیوں ہے؟ صرف اس لیے کہ کوئی جماعت امن و نظم پا نہیں سکتی جب تک کہ اس کا کوئی امیر نہ ہو۔

گھر اور خاندان بھی ایک چھوٹی سی جماعت ہے۔ تم گھر کے بڑے ہو لیکن امیر ہیں۔ گھر کی عافیت و امان اور انتظام و کامیابی اسی پر موقوف ہے کہ

سب تمہاری سنیں اور تمہارے کہنے پر چلیں۔ تو پھر اسلام بھی کہتا ہے کہ اقوامِ عالم کا نظم و ضبط اس وقت تک ہو نہیں سکتا۔ جب تک کہ ایک امیر و صدر، خلیفہ و حاکم مرکزی نہ ہو اور اس کی اطاعت نہ کی جائے۔

لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اقتدار و اطاعت میں فرق ہے، اور لوگوں نے ہمیشہ ان کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اور افراط و تفریط میں پھنس کر بڑے بڑے فتنے برپا کئے۔ معتزلہ و خوارج نے سمجھا کہ جب خلیفہ اور اس کے حکام کے خلاف، تنقید و روک ٹوک جائز ہے۔ تو ان کی اطاعت سے روگردانی کر کے بغاوت پھیلانا جائز ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر انہوں نے ہمیشہ خلفا کی اطاعت سے بغاوت و خروج کیا اور سیکڑوں فتنوں کا باعث بنے، ان کے مقابلے میں بھی فقہاء و علماء سو کی ایک جماعت اٹھی اور انہوں نے سمجھا کہ خلفاء و امراء کی اطاعت واجب ہے اور اس کی خلاف ورزی گناہ ہے۔ تو ان پر تنقید کرنا اور ان کے مظالم شدیدہ کے خلاف احتجاج کرنا بھی گناہ ہے۔ لہٰذا امراء و حکام کے اعمال خواہ کیسے بُرے ہوں، ہمیں چپ بیٹھ کر تماشہ دیکھنا چاہیئے۔ بلکہ اُن کی اعانت کرنا فرض ہے۔ کیونکہ یہ بھی اطاعتِ امیر ہے اور اطاعت امیر فرض ہے۔ لہٰذا امراء کی جور و جفا کے لئے میدان ہموار ہو گیا اور جب کبھی کسی ایک آدھ عالم ربانی نے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا سلسلہ شروع کیا اور "افضلُ الجہادِ کلمۃُ الحقِّ عِندَ السُّلطانِ جائرٍ" پر عمل کرنا شروع کیا سب سے پہلے اس کی مخالفت علماء ہی کی جانب سے کی گئی کہ یہ اطاعت امیر کا منکر ہے، لہٰذا باغی و خارجی ہے۔ یوں غلط فتوے دے کر سلاطین کے جور و ستم کے لئے جواز مہیا

کیا حقیقت یہ ہے کہ اگر پہلے گروہ نے تریق اختیار کی اور ترک اقتدار پر ترک اطاعت کو بھی قیاس کیا۔ اور اطاعت امیر کے باب میں تنگ نظری کا ثبوت دیا اور طرح طرح کے فتنے برپا کیے تو دوسرے گروہ نے بھی افراط سے کام لے کر وجوب اطاعت پر وجوب اقتدار کو قیاس کرکے" آزادی امرار کا باعث بنے اور دونوں نے امت میں فتنے کے دروازے کھولے۔ پہلے گروہ کے ذریعے سے ہمیشہ بغاوتوں کا سلسلہ شروع رہا۔ اور ملک کے امن وامان کو ہر وقت خطرہ لاحق رہا اور دوسرے گروہ کے ذریعے سے امرار و سلاطین کا دست تظلم آزاد ہوگیا۔ اور ہمیشہ علمار حق کی گردنوں پر ان کی تلوار بے نیام رہی اور اس وجہ سے ہزاروں علمار حق کا خون بہایا گیا۔ درحقیقت اس فتنے کے مضر اثرات پہلے فتنے سے کہیں زیادہ تھے۔

مسئلہ کی حقیقت یہ ہے کہ خلیفہ یا امیر وقت کی اطاعت سے مراد ہے" اس کے حکم کو ماننا اور اس پر عمل" اور بے شک یہ فرض ہے۔ اور اس کا تارک مجرم" لیکن اقتدار اطاعت سے الگ چیز ہے۔

اقتدار کا مطلب ہے کہ خلیفہ و بادشاہ کے ہر حکم و قانون کو جائز سمجھا جائے اور اس کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھائی جائے کہ یہ حکم یا یہ قانون غلط ہے۔ اس کو ماننا اور برتنا ضروری ہے۔ پس جو قانون یا حکم، خلیفہ یا بادشاہ یا ان کے کسی نائب کی طرف سے جاری ہو" اس پر عمل کیا جائے لیکن اگر وہ غلط ہے تو اس کی غلطی کو ظاہر کیا جائے۔ خلیفہ کو بھی دعوت دی جائے کہ یہ غلط ہے اسکو بدل" اور عوام میں بھی اسکے خلاف نفرت پھیلانا اور اسکے غلط ہونے کا ذہن پیدا کرنا ضروری ہے۔ اور یہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اقتضا ہے اور اسکے حکم کی تعمیل ہے پس اطاعت فرض و ضروری ہے اور اقتدار خلاف شرع" امور میں ناجائز اور منع ہے۔

جغرافیائی مرکزیت

کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ جب تک اس کا کوئی ارضی مرکز نہ ہو، کوئی تعلیم باقی نہیں رہ سکتی جب تک اس کی قائم وجاری درس گاہ نہ ہو، کوئی دریا جاری نہیں رہ سکتا جب تک ایک محفوظ سرچشمہ سے اس کا لگاؤ نہ ہو۔

نظام شمسی کا ہر ستارہ روشنی اور حرارت صرف اپنے مرکز شمسی ہی سے حاصل کرتا ہے۔ اسی کی بالاتر جاذبیت ہے جس نے یہ پورا معلق کارخانہ سنبھال رکھا ہے۔ اَللّٰہُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَہَا ط ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ط۔

یہی قانون الٰہی ہے جس پر اس کی شریعت کے تمام جماعتی احکام مبنی ہیں، پس جس طرح اسلام نے امت کے بقا اور حق و ہدایت کے لئے ہر طرح کے مرکز قرار دیئے۔ ضرور تھا کہ ایک ارضی مرکز بھی قیامت تک کے لئے قرار دے دیا جائے۔

ان بے شمار مصلحتوں اور حکمتوں کی بنا پر جن کی تشریح کا یہ موقع نہیں اسلام نے اس غرض سے سرزمین حجاز کو منتخب فرمایا۔ یہی ناف زمین کی آخری اور دائمی ہدایت و سعادت کے لئے مرکزی سرچشمہ اور روحانی درس گاہ قرار پائی۔ اور چونکہ سرزمین حجاز، جزیرہ عرب میں واقع تھی۔ وہی اسلام کا اولیں موطن، وہی اس کا سب سے پہلا سرچشمہ تھا۔ اس لئے ضرور تھا کہ اسلامی مرکز کے قریبی گرد و پیش کا بھی وہی حکم ہوتا جو اصل مرکز کا۔ لہٰذا یہ تمام سرزمین بھی کہ حجاز کی "وادی غیر ذی زرع" کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس حکم میں داخل ہو گئی۔

ذَالِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ط

مرکزی ارض سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی دعوت ایک عالمگیر اور دنیا کی بین الملی دعوت تھی، وہ کسی خاص ملک اور قوم میں محدود نہ تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کے اجزار تمام کرہ ارض میں بکھر جانے اور پھیل جانے والے تھے۔ پس ان بکھرے ہوئے اجزار کو ایک دائمی متحدہ قومیت کی ترکیب میں قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ کوئی ایک مقام ایسا مخصوص کر دیا جاتا جو ان تمام متفرق و منتشر اجزار کے لئے اتحاد و انضمام کا مرکزی نقطہ ہوتا۔ سارے بکھرے ہوئے اجزار وہاں پہنچ کر سمٹ جاتے، تمام پھیلی ہوئی شاخیں وہاں اکٹھی ہو کر جڑ جاتیں۔ ہر شاخ کو اس کی جڑ سے زندگی ملتی۔۔۔۔ ہر نہر اس سرچشمہ سے سیراب ہوتی۔ ہر ستارہ اس سورج سے روشنی اور گرمی لیتا۔ ہر دوری اس سے قرب پاتی۔ ہر فصل کو اس سے مواصلت ملتی۔ ہر انتشار کو اس سے اتحاد و یگانگی حاصل ہوتی۔ وہی مقام تمام امت کی تعلیم و ہدایت کے لئے ایک وسطی درس گاہ کا کام دیتا۔ وہی تمام کرہ ارضی کی پھیلی ہوئی

کثرت کے لیئے نقطۂ وحدت ہوتا ساری دنیا ٹھنڈی پڑ جاتی۔ پر اس کا تنور یہ کبھی نہ بجھتا ساری دنیا تاریک ہو جاتی۔ مگر اس کی روشنی گل نہ ہوتی۔ اگر تمام دنیا اولاد آدم کے باہمی جنگ وجدال اور فتنہ وفساد سے خوں ریزی کا دوزخ بن جاتی۔ پھر بھی ایک گوشۂ قدس ایسا رہتا جو ہمیشہ امن وصحت کا بہشت ہوتا اور انسانی فتنہ وفساد کی پرچھائیں بھی وہاں نہ پڑ سکتی۔

اس کا ایک ایک چپہ مقدس ہوتا' اس کا ایک ایک کونہ خدا کے نام پر محترم ہو جاتا' اس کا ایک ایک ذرہ اس کے جلال وقدوسیت کا جلوہ گاہ ہوتا۔ خوں ریز اور سرکش انسان ہر مقام کو اپنے ظلم وفساد کی نجاست سے آلودہ کر سکتا۔ پر اس کی فضا مقدس ہمیشہ پاک ومحفوظ رہتی۔ اور جب زمین کے ہر گوشے میں انسانی سرکشی اپنی مجرمانہ خداوندی کا اعلان کرتی تو وہاں خدا کی سچی بادشاہت کا تختِ عظمت وجلال بچھ جاتا۔ اور اس کا ظلّ عاطفت تمام بندگان حق کو اپنی طرف کھینچ بلاتا۔

دنیا پر کفر وشرک کے جماؤ اور اٹھان کا کیسا ہی سخت اور برا وقت آجاتا مگر یہی توحید اور بے میل خدا پرستی کا وہ ایک ایسا گھر ہوتا جہاں خدا اور اس کی صداقت کے سوا نہ کسی خیال کی پہنچ ہوتی۔ نہ کسی صدا کی گونج اٹھ سکتی۔ وہ انسان کی پھیلی ہوئی نسل کے لیئے ایک مشترک اور عالمگیر گھر ہوتا۔ کٹ کٹ کر قومیں وہاں جڑ رہتیں۔ اور بکھر بکھر کے نسلیں وہاں سمٹتیں' پرند جس طرح اپنے آشیانوں کی طرف اڑتے ہیں اور پروانوں کو تم نے دیکھا کہ روشنی کی طرف دوڑتے' ٹھیک اسی طرح انسانوں کے گروہ اور قوموں کے قافلے اس کی طرف دوڑتے اور زمین کی خشکی' تری کی وہ ساری راہیں جو اس تک پہنچ سکتیں۔ ہمیشہ مسافروں اور

قافلوں سے بھری رہتیں،

دنیا بھر کے زخمی دل وہاں پہنچتے اور شفا اور تندرستی کا مرہم پاتے۔ بے قرار و مضطر روحوں کے لئے اس کے آغوش گرم میں آرام و سکون کی ٹھنڈک ہوتی۔ گناہوں کی کثافتوں سے آلودہ جسم وہاں لائے جاتے اور محرومی اور نامرادی کی مایوسیوں سے گھائل دل چیختے اور تڑپتے ہوئے اس کی جانب دوڑتے۔ تو اس کی پاک ہوا امید و مراد کی عطر بیزی سے مشکبار ہو جاتی۔ اس کے پہاڑوں کی چوٹیاں خدا کی محبت و بخشش کے بادلوں میں چھپ جاتیں اور اس کی مقدس فضا میں رحمت کے فرشتے غول در غول اتر کر اپنی معصوم مسکراہٹ اور اپنے پاک نغموں کے ساتھ، مغفرت اور قبولیت کی بشارتیں بانٹتے۔

شاخوں کی شادابی جڑ پر موقوف ہے، درختوں کی جڑ سلامت ہے تو شاخوں اور پتوں کے مرجھا جانے سے باغ اجڑ نہیں سکتا۔ دس ٹہنیاں کاٹ دی جائیں گی تو بیس نئی نکل آئیں گی۔ اس طرح قوم کا مرکز ارضی اگر محفوظ ہے تو اس کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کی بربادی سے قوم نہیں مٹ سکتی۔ سارے ٹکڑے مٹ جائیں، اگر مرکز باقی ہے تو پھر نئی نئی شاخیں پھوٹیں گی۔ اور نئی نئی زندگیاں ابھریں گی۔ پھر جس طرح مسلمانوں کے اجتماعی دائرہ کے لئے خلیفہ و امام کے وجود کو مرکز ٹھہرایا گیا۔ اسی طرح ان کی ارضی وحدت و انتشار کے لئے عبادت کدہ ابراہیم کو کعبۃ اللہ اس کی سرزمین حجاز، اور اس کا ملک جزیرہ عرب، دائمی مرکز مقرر پایا۔ یہی معنی ان آیات کریمہ کے ہیں۔ کہ

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ ط

اللہ نے کعبہ کو اس کا محترم گھر بنایا۔ انسانوں کے بقاء و قیام کا باعث ٹھہرایا۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا۔

اور جب ایسا ہوا کہ ہم نے خانہ کعبہ کو انسانوں کے لیے اجتماع کا مرکز اور امن کا گھر بنایا، اور

مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ط

جو اس کے حدود کے اندر پہنچ گیا۔ اس کے لیے کسی طرح کا خوف اور ڈر نہیں

اور یہی علت تھی تحویل قبلہ کی۔ نہ وہ جو کہ لوگوں نے سمجھی۔

وَحَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ۔

اور تم کہیں بھی ہو لیکن چاہیئے کہ اپنا رخ اسی کی جانب رکھو۔

کیونکہ جب یہی مقام، ارضی مرکز قرار پایا تو تمام افراد اقوام کے لیے لازمی ہوا کہ جہاں کہیں بھی ہوں، رخ ان کا اسی طرف رہے اور دن میں پانچ مرتبہ اپنے قومی مرکز کی طرف متوجہ ہوتے رہیں۔ اور یاد رہے کہ منجملہ بے شمار مصالح و حکم کے ایک بڑی مصلحت فریضہ حج میں یہ بھی ہے کہ ساری امت، تمام کرہ ارضی۔ اور تمام اقوام عالم کو اس نقطہ مرکز سے دائمی پیوستگی بخش دی۔

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ

مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ط

اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو۔ پھر ایسا ہوگا کہ ساری دنیا کو یہ گوشہ برکت کھینچ بلائے گا، لوگوں کے پیادے اور سوار قافلے دور دور سے یہاں پہنچیں گے

اس مرکز کے قیام و بقا کے لیے سب سے پہلی بات یہ ہے کہ

دائمی طور پر اس کو صرف اسلام کے لئے مخصوص کر دیا جائے۔ جب تک یہ خصوصیت قائم نہ کی جاتی، امت کے لئے اس مرکزیت کے مطلوبہ مقاصد و مصالح حاصل نہ ہو سکتے۔

چنانچہ اسی بنا پر مسلمانوں کو حکم دیا گیا اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا۔ مسجد حرام کے حدود صرف توحید کی پاکی کے لئے مخصوص ہیں، اب آئندہ کوئی غیر مسلم اس کے قریب بھی نہ آنے پائے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ وہاں غیر مسلم نہ آئیں بلکہ کسی حال میں داخل بھی نہ ہوں۔

جمہور اہل اسلام نے اتفاق کیا کہ مسجد حرام سے صرف احاطۂ کعبہ ہی نہیں ہے بلکہ تمام سرزمین حرم ہے۔ اور دلائل و مباحث اس کے اپنے مقام پر درج ہیں۔

اس طرح احادیث صحیحہ و کثیرہ سے جو حضرت علیؓ، سعد بن وقاصؓ، جابرؓ، ابوہریرہؓ، عبداللہ بن زیدؓ، رافع بن خدیجؓ، سہیل بن حنیفؓ، وغیرہم اجلہ صحابہ سے مروی ہیں، ثابت ہو چکا ہے کہ مدینہ کی زمین بھی مثل مکہ کے حرم ہے۔ اور وثور اس کے حدود ہیں۔

اَلْمَدِیْنَةُ حَرَامٌ بَیْنَ عَیْرٍ اِلٰی ثَوْرٍ اَخْرَجَهُ الشَّیْخَانِ اور روایت سعد کہ اِنْ اُحَرِّمُ مَا بَیْنَ لَابَتَیِ الْمَدِیْنَةِ اَنْ یُّقْطَعَ عِضَاهُهَا وَیُقْتَلَ صَیْدُهَا۔ رواہ مسلم اور روایت انسؓ متفق علیہ کہ

اَللّٰهُمَّ اِنَّ اِبْرَاهِیْمَ حَرَّمَ مَكَّةَ. وَاِنِّیْ اُحَرِّمُ مَا بَیْنَ لَابَتَیْهَا.

خدایا ابراہیم نے مکہ کو حرم ٹھہرایا اور میں مدینہ کو حرم ٹھہراتا ہوں۔

یہ احکام تو خاص اس مرکز کی نسبت تھے۔ باقی رہا اس کا گرد و پیش یعنی جزیرہ عرب تو گو اس کے لئے اس قدر اہتمام کی ضرورت نہ تھی، تاہم اس کا خالص اسلامی ملک ہونا ضروری تھا تاکہ اسلامی مرکز کا گرد و پیش اور اس کا مولد و منشا ہمیشہ غیروں کے اثر سے محفوظ رہے۔

اسلام کا جب ظہور ہوا تو علاوہ مشرکین عرب کے یہود و نصاریٰ کی بھی ایک بڑی جماعت جزیرہ عرب میں آباد تھی۔ مدینہ میں متعدد یہودیوں کے قبیلے تھے۔ خیبر میں انہی کی ریاست تھی۔ یمن میں نجران بہت بڑا عیسائیوں کا مرکز تھا۔ مدینہ میں آپ کی زندگی ہی میں یہودیوں سے سرزمین خالی ہو گئی۔ آخری جماعت جو مدینہ سے خارج کی گئی بنو قینقاع اور بنو حارثہ کا گروہ تھا۔ امام مسلم نے ابن عمر کا قول نقل کیا ہے۔

إِنَّ يَهُودَ بَنِي النَّضِيرِ حَارَبُوا رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَجْلَى بَنِي النَّضِيرِ وَأَقَرَّ قُرَيْظَةَ وَمَنَّ عَلَيْهِمْ حَتَّى حَارَبَتْ قُرَيْظَةُ فَقَتَلَ رِجَالَهُمْ وَقَسَمَ أَوْلَادَهُمْ وَنِسَاءَهُمْ بَيْنَ الْمُسْلِمِينَ إِلَّا بَعْضَهُمْ لَحِقُوا بِرَسُولِ اللّٰهِ فَأَمَّنَهُمْ وَأَسْلَمُوا۔ وَأَجْلَى يَهُودَ الْمَدِينَةِ كُلَّهُمْ بَنِي قَيْنُقَاعَ وَهُمْ قَوْمُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ وَيَهُودَ بَنِي حَارِثَةَ وَكُلَّ يَهُودِيٍّ كَانَ بِالْمَدِينَةِ۔

بخاری و مسلم میں اس آخری اخراج کا واقعہ بروایت حضرت ابوہریرہؓ مروی ہے۔ آپ صحابہ کو ساتھ لے کر یہودیوں کی تعلیم گاہ میں تشریف لے گئے اور فرمایا

یا مَعْشَرَ الْیَھُوْدِ اَسْلِمُوْا تَسْلَمُوْا۔ اسلام قبول کرو۔ نجات پاؤ گے پھر فرمایا۔
اِعْلَمُوْا اَنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاِنِّیْ اُرِیْدُ اَنْ اُجْلِیَکُمْ مِنْ ھٰذِہِ
الْاَرْضِ فَمَنْ وَجَدَ مِنْکُمْ بِمَالِہٖ شَیْئًا فَلْیَبِعْہُ وَاِلَّا فَاعْلَمُوْا اَنَّ
الْاَرْضَ لِلّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ۔ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ تم کو اس ملک سے خارج کر دوں۔
پس اپنا مال متاع فروخت کرنا چاہو تو کر دو ورنہ جان رکھو کہ اس ملک کی حکومت
صرف اللہ اور اس کے رسول ہی کے لئے ہے۔

جب آپ دنیا سے تشریف لے گئے تو دو مقام ایسے رہ گئے تھے جہاں
سے یہود اور نصاریٰ کا اخراج نہ ہو سکا خیبر اور نجران۔ پس آپؐ نے وصیت فرمائی
کہ آئندہ جزیرہ عرب صرف اسلام کے لئے مخصوص کر دیا جائے۔ جو غیر مسلم اس ملک
میں باقی رہ گئے ہیں، خارج کر دیئے جائیں۔ امام بخاری نے باب باندھا ہے۔

اِخْرَاجُ الْیَھُوْدِ مِنْ جَزِیْرَۃِ الْعَرَبِ ط اس میں پہلی روایت یہود مدینہ
کے اخراج کی لائے ہیں جو اوپر گزر چکی ہے۔ دوسری روایت حضرت عبداللہ بن عباس
کی ہے۔ آنحضرت صلعم نے مرض الموت میں تین باتوں کی وصیت فرمائی تھی۔ ایک یہ
تھی۔ اَخْرِجُوا الْمُشْرِکِیْنَ مِنْ جَزِیْرَۃِ الْعَرَبِ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔ اِقْتَصَرَ
عَلٰی ذِکْرِ الْیَھُوْدِ لِاَنَّھُمْ یُوَحِّدُوْنَ اللّٰہَ تَعَالٰی اِلَّا الْقَلِیْلَ وَمَعَ ذٰلِکَ
اُمِرَ بِاِخْرَاجِھِمْ فَیَکُوْنُ اِخْرَاجُ غَیْرِھِمْ مِنَ الْکُفَّارِ بِطَرِیْقِ اَوْلٰی
فتح الباری ط یعنی امام بخاری نے عنوان باب میں صرف یہود کا ذکر کیا ہے اس
میں استدلال یہ ہے کہ تمام غیر مسلم اقوام میں یہودی سب سے زیادہ توحید کے
قائل ہیں، ان کو خارج کیا گیا تو دیگر مذاہب کے اخراج کا وجوب بدرجہ اولیٰ ثابت

ہو گیا. پس حاجت تصریح نہیں.

حضرت عمرؓ کی حدیث میں یہود و نصاریٰ کا لفظ ہے. لَأُخْرِجَنَّ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ حَتّٰى لَا أَدَعَ إِلَّا مُسْلِمًا ط رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَأَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَصَحَّحَهُ ط

ابو عبیدہ بن جراح سے امام احمد نے روایت کیا ہے.

آخِرُ مَا تَكَلَّمَ بِهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَخْرِجُوْا يَهُوْدَ مِنَ الْحِجَازِ وَأَهْلَ نَجْرَانَ مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ ط

حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت میں اس کی علت بھی واضح کر دی ہے.

آخِرُ مَا عَهِدَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ قَالَ لَا يُتْرَكُ بِجَزِيْرَةِ الْعَرَبِ دِيْنَانِ (رَوَاهُ أَحْمَدُ) یعنی سب سے آخری وصیت رسول اللہؐ کی یہ تھی کہ جزیرہ عرب میں دو دین جمع نہ ہوں، صرف اسلام ہی کے لئے خاص ہو جائے. امام مالک نے موطا میں عمر بن عبد العزیز اور ابن شہاب کے مراسیل نقل کئے ہیں، اور مسعودی، وغیرہم نے بھی باب باندھا ہے.

إِخْرَاجُ الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ. عمر بن عبد العزیز کی روایت میں ہے.

كَانَ مِنْ آخِرِ مَا تَكَلَّمَ بِهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى. اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ. لَا يَبْقَيَانِ دِيْنَانِ بِأَرْضِ الْعَرَبِ. اور ابن شہاب کا

نعقلہ ہے۔ لَا یَجْتَمِعُ دِیْنَانِ فِی جَزِیْرَۃِ الْعَرَبِ ط

حضرت عمر بن العزیز نے آخر تکلم۔ قَاتَلَ اللّٰہُ الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی جو نقل کیا ہے تو حضرت عائشہ سے صحیحین وغیرہما میں بطریق رفع بھی ثابت ہے۔۔

حافظ نووی نے گو امام بخاری کا اتباع کیا اور اِجْلَاءُ الْیَھُوْدِ کا باب استدلال کافی سمجھا۔ لیکن حافظ منذری نے تلخیص مسلم میں۔ اِخْرَاجُ الْیَھُوْدِ وَالنَّصٰرٰی مِنْ جَزِیْرَۃِ الْعَرَبِ کا الگ باب باندھ کر جزیرہ عرب والی روایتیں۔ روایات اجلاء یہود سے الگ کر دی ہیں۔ یہ وصیت نبوی علاوہ طریق بالا کے مسند امام احمد۔ مسندِ حمیدی۔ سنن بیہقی وغیرہ میں بھی مختلف طریقوں سے مروی ہیں اور سب کا مضمون متحدہ اور باہمدگر اجمال وتبین اور اعتقاد وتقویت کا حکم رکھتا ہے۔

احکام شرعیہ دو قسم کے ہیں' ایک قسم ان احکام کی ہے جن کا تعلق افراد کی اصلاح وتزکیہ سے ہوتا ہے' جیسے تمام اوامر ونواہی اور فرائض وواجبات دوسرے وہ میں جن کا تعلق افراد سے نہیں بلکہ امت کے قومی اور اجتماعی فرائض اور ملکی سیاسیات سے ہوتا ہے' جیسے فتح ممالک اور قوانین سیاسیہ وملکیہ۔

سنت الٰہی یوں واقع ہوئی ہے کہ پہلی قسم کے احکام خود شارع کی زندگی ہی میں تکمیل تک پہنچ جاتے ہیں اور وہ دنیا نہیں چھوڑتا مگر ان کی تکمیل کا اعلان کر کے۔ لیکن دوسری قسم کے لئے ایسا ہونا ضروری نہیں۔ بسا احکام ایسے ہوتے ہیں۔ جن کے نفاذ اور وقوعہ کے لئے ایک خاص وقت مطلوب ہوتا ہے اور وہ شارع کے بعد بتدریج تکمیل وتنفیذ پاتے ہیں پس ان کی نسبت یا تو بطریق پیش گوئی کے خبر دے دی جاتی ہے یا اپنے جانشینوں کو

کو وصیت کردی جاتی ہے۔

یہ معاملہ اسی دوسری قسم میں تھا کہ اس کا پورا پورا نفاذ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ ہی میں ہو جاتا۔ آپؐ نے یہود مدینہ کے اخراج سے عملاً نفاذ شروع کر دیا۔ یہود خیبر سے ابتدا میں شرط کر لی تھی۔ کہ جب ضرورت ہوگی اس سرزمین سے خارج کر دیئے جاؤ گے۔

پھر تکمیل کے لئے اپنے جانشینوں کو وصیت فرمادی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں تکمیل کا وقت آگیا۔ اور یہود خیبر نے طرح طرح کی شرارتیں اور نافرمانیاں کر کے خود ہی اس کا موقع پہنچا دیا۔ پس حضرت عمرؓ نے اس وصیت کی تحقیق کی، اور جب پوری طرح تصدیق ہو گئی تو تمام صحابہ کو جمع کر کے اعلان کر دیا۔ سب نے اتفاق کیا اور یہود خیبر و فدک سے خارج کر دیئے گئے۔ اس طرح نجران سے بھی عیسائیوں کا اخراج عمل میں آیا۔ امام زہری نے ابن عتبہ سے اور امام مالک نے ابن شہاب سے روایت کیا ہے۔

مَازَالَ عُمَرُ حَتّٰی وَجَدَ الثَّبْتَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ اَنَّهٗ قَالَ لَا يَجْتَمِعُ بِجَزِيْرَةِ الْعَرَبِ دِيْنَانِ۔ فَقَالَ مَنْ كَانَ لَهٗ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابَيْنِ عَهْدٌ فَلْيَاْتِ بِهٖ اُنْفِذْ لَهٗ، وَاِلَّا فَاِنِّیْ مُجْلِيْكُمْ فَاَجْلَاهُمْ اَخْرَجَهٗ ابْنُ اَبِیْ شَيْبَةَ۔

امام بخاری نے یہود خیبر کے اخراج کا واقعہ کتاب الشروط کے باب اِذَا اشْتَرَطَ فِی الْمُزَارَعَةِ اِذَا شِئْتُ اَخْرَجْتُكَ میں درج کیا ہے اور ترجمہ میں استدلال ہے کہ یہود خیبر کا تقرر پہلے ہی سے عارضی و مشروط تھا۔ بالاستقلال نہ تھا۔ حافظ

عسقلانی لکھتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے اجلا کردہ اہل کتاب کی تعداد چالیس ہزار منقول ہے۔

پس صاحب شریعت کے قول و عمل ان کے آخرین لمحات حیات کی وصیت حضرت عمرؓ کے تفحص و تصدیق۔ تمام صحابہ کے اجماع و اتفاق سے یہ بات ثابت ہو گی کہ اسلام نے ہمیشہ کے لئے جزیرۂ عرب کو صرف اسلامی آبادی کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ اِلّا یہ کہ کسی مصلحت سے خلیفۂ وقت عارضی طور پر کسی گروہ کو داخل ہونے کی اجازت دے دے اور ظاہر ہے کہ جب وہاں غیر مسلموں کا قیام اور دو دینوں کا اجتماع، شریعت کو منظور نہیں تو غیر مسلم کی حکومت یا حاکمانہ نگرانی و بالادستی کو جائز رکھنا کب مسلمانوں کے لئے جائز ہو سکتا ہے۔

باقی رہا یہ مسئلہ کہ جزیرۂ عرب سے مقصود کیا ہے؟ تو یہ بالکل واضح ہے۔ اس کے لئے کسی بحث و نظر کی ضرورت ہی نہیں۔ نص حدیث میں "جزیرۂ عرب" کا لفظ وارد ہے اور عقلاً و اصولاً معلوم ہے کہ جب تک کوئی سبب قوی موجود نہ ہو کسی لفظ کے منطوق اور عام و متعارف مدلول سے انحراف جائز نہ ہوگا اور نہ بلا مخصص کے قیاساً تخصیص جائز۔ شارع نے "جزیرہ" کا لفظ کہا اور دنیا میں اس وقت سے لے کر اب تک جزیرۂ عرب کا اطلاق ایک خاص ملک پر ہر انسان کر رہا اور جان رہا ہے۔ پس جو مطلب اس کا سمجھا جاتا تھا اور سمجھا جاتا ہے وہی سمجھا جائے گا۔

تمام مورخین اور جغرافیہ نگاران قدیم و جدید متفق ہیں کہ عرب کو "جزیرہ" اس لئے کہا گیا کہ تین طرف سمندر اور ایک طرف دریا کے پانی سے محصور ہے۔ یعنی تین

طرف بحر ہند، خلیج فارس بحر احمر و قلزم ہیں۔ ایک طرف دریائے دجلہ و فرات۔

فتح الباری وغیرہ میں ہے قال الخلیل سمیت جزیرۃ العرب لان بحر فارس وبحر الحبشۃ والفرات ودجلۃ احاطت بہا اور اصمعی کا قول ہے لاحاطۃ البحار بہا یعنی بحر الہند والقلزم وبحر الحبشۃ ودجلۃ

نہایہ میں امام زہری کا قول نقل کیا ہے۔ سمیت جزیرۃ لان بحر الفارس وبحر اسودان احاطا بجانبیہا واحاطا بالجانب الشمالی دجلۃ وفرات۔

یہی قول ارباب لغت کا بھی ہے۔ قاموس میں ہے۔ جزیرہ عرب احاط بہ بحر الہند والشام ثم دجلۃ والفرات پروفیسر بطرس بستانی نے بھی (جو زمانہ حال میں شام کا ایک مشہور مسیحی مصنف گزرا ہے۔ اور جس نے عربی میں انسائیکلوپیڈیا لکھنی شروع کی تھی "محیط المحیط" میں یہی تعریف کی ہے۔

حاصل سب کا یہی ہے کہ جزیرۂ عرب وہ سرزمین ہے جس کے تین جانب سمندر ہیں اور شمالی جانب دریائے دجلہ و فرات، سب سے زیادہ مفصل جغرافیہ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں دیا ہے۔ اس سے زیادہ جامع و معتبر کتاب عربی میں جغرافیہ و تقویم البلدان کی کوئی نہیں۔

انما سمیت بلاد العرب جزیرۃ العرب لاحاطۃ الانہار
والبحار بہا من جمیع اقطارہا واطرافہا فصاروا منہا فی مثل الجزیرۃ من جزائر البحر وذلک ان الفرات اقبل من بلاد الروم فظہر بناحیۃ قنسرین ثم انحط علی اطراف الجزیرۃ وسواد العراق حتی وقع فی البحر فی ناحیۃ البصرۃ والایلۃ۔ وامتد الی عمان
واخذ البحر فی ذالک الموضع مغربا ببلاد العرب ط

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ عرب اس لئے جزیرہ مشہور ہوا کہ سمندروں اور

دریاؤں سے گھرا ہوا ہے۔ صورت اس کی یوں ہے کہ دریائے فرات بلد ردم سے شروع ہوا اور قنسرین کے نواح میں عرب کی سرحد پر ظاہر ہوا۔ پھر عراق میں ہوتا ہوا بصرہ کے پاس سمندر میں جا ملا۔ وہاں سے پھر سمندر نے عرب کو گھیرا اور قطیف و ہجر کے کناروں سے ہوتا ہوا عمان اور شام سے گزر گیا۔ پھر حضر موت اور عدن ہوتا ہوا پچھم کی جانب یمن کے ساحلوں سے ٹکرایا۔ حتیٰ کہ جدہ نمودار ہوا جو مکہ و حجاز کا ساحل ہے۔ پھر ساحل طور اور خلیج ایلیہ پر جاکر سمندر کی شاخ ختم ہوگئی۔

پھر سرزمین طور شروع ہوتا ہے اور قلزم نمودار ہوتی ہے۔ اور اس کا سلسلہ بلد فلسطین سے سواحل عسقلان ہوتا ہوا، سرزمین صور و ساحل اردن تک بیروت پہنچتا ہے اور آخر میں پھر قنسرین تک منتہی ہو کر وہ جگہ آتی ہے جہاں سے فرات نے عرب کا احاطہ شروع کیا تھا۔ پس اس طرح چاروں طرف پانی کا سلسلہ قائم ہے۔ بحر احمر و قلزم کی درمیانی خشکی بھی پانی سے خالی نہیں، کیونکہ سوڈان سے دریائے نیل وہاں آ پہنچتا ہے اور قلزم میں گرتا ہے۔ یہی جزیرہ ہے جس سے عرب کی سرزمین عبارت ہے۔ اور یہی عرب اقوام کا مولد و منشا ہے۔ انتہا ملخصاً" جلد ۱۳ صـ۱۱)

اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ جزیرۂ عرب کے حدود کیا ہیں۔ عرب کا نقشہ اپنے سامنے رکھو اور اس پر مندرجہ بالا تخطیط منطبق کر کے دیکھو۔ اوپر شمال ہے۔ داہنے مشرق، بائیں مغرب۔ سے گزرتا ہوا دجلہ میں مل جاتا ہے۔ پھر دونوں مل کر خلیج فارس میں گرتے ہیں۔ فرات کے پیچھے دجلہ کا خط ہے، اسی پر بغداد واقع ہے۔

خلیج فارس کے مشرق میں ایران ہے اور مغربی ساحل میں قطیف و ہجر۔ پھر یہ خلیج تنگنائے ہرمز سے نکل کر مسقط و عمان کے کنارے سے گزرتا ہے۔ اور اس کے

بعد ہی بحر عمان نمودار ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد حضرموت کا ساحل دیکھو گے۔ پھر عدن آگیا۔ اور باب المندب سے جوں ہی آگے بڑھے بحر احمر شروع ہو گیا۔ چونکہ اس کا مغربی ساحل افریقہ وحبش سے متصل ہے۔ اس لئے قدیم جغرافیہ میں اس کو بحر حبش بھی کہتے ہیں۔ بحر احمر کے کنارے پہلے یمن ملے گا پھر جدہ اس کے بعد ساحل حجاز، حتیٰ کہ سمندر کی شاخ پتلی ہو کر طور سینا تک منتہی ہو گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی خلیج عقبہ کی شاخ نمودار ہوئی۔

اب مصر کی سرزمین شروع ہو گئی۔ نہر سویز کے بننے سے پہلے یہ خشکی کا ایک ٹکڑا تھا۔ جس کو بحر احمر نے متوسط سے جدا کر دیا تھا۔ اس لئے صاحب معجم نے یہاں دریائے نیل کا ذکر کیا جس کو اس درمیانی قطعہ خشک کی بائیں جانب دیکھ رہے ہو۔ وہ قاہرہ سے ہوتا ہوا اسکندریہ کے پاس سمندر میں گرتا ہے۔ پس اگرچہ اس زمانہ میں یہ ٹکڑا خشک تھا۔ مگر سمندر کی جگہ دریائے نیل کا خطہ آبی موجود تھا۔ اس کے بعد بحر متوسط ہے۔ جس کے ابتدائی حصہ کو قدیم جغرافیہ بحر مصر و شام سے موسوم کرتے تھے۔ اس پر بیروت واقع ہے۔ اور ساحل کے اندر کی جانب دیکھو گے تو پھر وہی مقام سامنے ہوگا جہاں سے دریائے فرات نمودار ہو کر خلیج فارس کی جانب بڑھا تھا۔

پس یہ مثلث نما ٹکڑا ہے جو اس تمام بحری احاطہ کے اندر واقع ہے۔ صرف خشکی کا ایک حصہ شمال میں فرات کے بائیں جانب نظر آتا ہے۔ یعنی سرحد شام۔ یہی مثلث ٹکڑا، جزیرہ عرب ہے۔ قدیم وجدید جغرافیہ نگار اس پر متفق ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ عرب کے "جزیرے" اور جزیرہ نما ہونے میں سب سے اہم وجود دریائے دجلہ وفرات کا ہے کیونکہ اگر یہ عرب کے حدود سے کوئی متصل تعلق نہیں رکھتے۔ تو پھر اس کی ایسی صورت ہی باقی نہیں رہتی جس پر جزیرہ کا اطلاق

ہو سکے۔ یعنی شمال کی جانب بالکل خشک رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس کسی نے عرب کی تعریف کی۔ احاطۂ بحر و نہر کا لفظ کہہ کر واضح کر دیا کہ جانب شمال، دجلہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اور جنہوں نے مقامات کے نام لے کر حدود متعین کئے۔ انہوں نے بھی صاف کہہ دیا کہ شمالی حد، دجلہ ہے نہایہ۔ معجم البلدان اور فتح الباری میں اصمعی کا قول منقول ہے۔

مِنْ اَقْصٰی عَدَنٍ اِلٰی رِیْفِ الْعِرَاقِ طُوْلًا وَّمِنْ جُدَّۃٍ وَسَاحِلِ الْبَحْرِ اِلٰی اَطْرَافِ الشَّامِ عَرْضًا۔

کرمانی نے کہا۔

هِیَ مَابَیْنَ عَدَنٍ اِلٰی رِیْفِ الْعِرَاقِ طُوْلًا وَمِنْ جُدَّۃٍ اِلَی الشَّامِ عَرْضًا

یہی قاموس میں ہے ایسا ہی ابن کلبی سے مروی ہے وقاعہ بک طہطاوی نے قدیم و جدید کتب سے اخذ کر کے عربی میں تعریفات الناوجاید الجغرافیہ لکھی اس میں یہی حدود ہیں۔ پس صاحب معجم کی تفصیل اور تمام اقوال سے ثابت ہو گیا کہ جزیرۂ عرب، طول میں عدن سے لے کر عراق کی ترائی تک اور عرض میں ساحل بحر احمر سے خلیج فارس تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی حد شمال میں دہنی جانب دجلہ ہے۔ اور اگر عرض کا خط کھینچیں تو بائیں جانب شام۔ آج کل کے جغرافیوں میں بھی عرب کے یہی حدود بتائے جاتے ہیں۔ پچھم میں بحر احمر، جنوب میں بحر ہند پورب میں خلیج فارس اور دکن میں ملک شام۔

اس معجم البلدان میں عراق کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے اِنَّهَا اَسْفَلُ اَرْضِ الْعَرَبِ یعنی عراق اس لئے نام ہوا کہ زمین عرب کا سب سے زیادہ نچلا حصہ ہے۔ اس سے بھی ثابت ہوا کہ عراق عرب میں داخل ہے۔ البتہ عراق کا وہ حصہ جو دجلہ کے پار واقع ہے اس میں داخل نہ ہوگا۔

فکری وحدت
اور
فکری مرکزیت

قرآن کہتا ہے اقتدار اعلیٰ و قوت حاکمہ صرف خدا کے لئے مانی جائے۔ اس کے سوا کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کے سامنے سر نیاز خم کیا جائے۔ اور اپنی پیشانیوں کو جھکایا جائے۔ وہی وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے۔ صرف وہ ایک ہی اس لائق ہے کہ اس کے لئے قوت حاکمہ اور اقتدار اعلیٰ مانا جائے۔ وہی ایک صرف اس قابل ہے کہ بنی نوع انسان کے دلوں پر حکومت کرے، وہی اس کا مستحق ہے کہ جبین نیاز و سر عجز اس کے سامنے خم کیا جائے دل و دماغ میں صرف اس کا خوف سمائے، امیدیں اسی سے وابستہ کی جائیں۔ حاکم و بادشاہ شاہنشاہ و واضع قانون، شارع و قانون ساز صرف اس کو مانا جائے۔ ماننے کے لائق اور تسلیم کے قابل صرف اس کا قانون ہو سکتا ہے۔ صرف اس کے لئے جانی و مالی قربانی کی جائے۔ ایثار و فداکاری کے لائق صرف وہی ہے۔ وہی ہے جس سے محبت کی جائے اور دل لگایا جائے۔ اسی سے ڈرایا

جائے۔ اس کے سوا کوئی پناہ گاہ نہیں۔ کوئی ماویٰ و ملجا نہیں۔ اس کے سوا کوئی نہیں جو نفع پہنچا سکے۔ یا ضرر دے سکے۔ وہ جس کو ضرر دینا چاہے تو کوئی طاقت اس کو روکنے والی نہیں، اگر وہ کسی کو نفع پہنچانا چاہے تو کوئی اس کے ہاتھ روک نہیں سکتا، وہی اللہ ہے، وہی معبود، وہی رب، وہی حاکم اَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَالْاَمْرُ خبردار، اس کے لئے حکومت ہے اور اسی کا امر قابل قبول ہے۔ کوئی نہیں جس کا حکم مانا جائے۔ کوئی نہیں جس کا امر تسلیم کیا جائے۔ انسان کے ظاہر و باطن پر صرف اسی کی حکمرانی ہے، تو پھر تمہارے قلوب و اعمال و افعال و کاروبار زندگی میں اسی کی حکمرانی کیوں نہ ہو۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا مختلف قسم کے الٰہ و معبود بنا لیتی ہے۔ کہیں انسانی استبداد و استعباد کے وہ مہیب بت ہیں، جنہوں نے اپنی غلامی کی زنجیروں سے خدا کے بندوں کو جکڑ دیا ہے۔ اور ان کی قوت شیطانی کے مظاہر کبھی حکومتوں کے جبر و تسلط کی صورت میں، کبھی دولت و مال میں اور عزت و جاہ کے غرور میں، کبھی جماعتوں کی رہنمائی و حکمرانی کے ادعا میں اور کبھی علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے گھمنڈ میں۔ غرضیکہ مختلف شکلوں میں اور مختلف ناموں سے، اللہ کے بندوں کو اللہ سے چھیننا چاہتے ہیں۔ اور کہیں چاندی اور سونے کے ڈھیروں کے بت اور کہیں قیمتی کپڑوں میں اور موٹروں اور ہوٹلوں اور کوٹھیوں کے بت اور اس میں لیڈروں و حکام کے بت ہیں۔ کہیں خواہشات نفسانی کے بت ہیں۔ رسول عربی کے وقت میں تو تین سو ساٹھ بت تھے جن سے بیت خلیل کی دیواریں چھپ گئی تھیں، لیکن آج ان کی امت میں تو ہر چمکیلی ہستی لات اور منات کی قائم مقام ہے اور حاکم، امیر، رئیس اور حکام رئیس اور سب سے آخر مگر سب سے پہلے ہر

خوش لباس لیڈر، ایک بت کا حکم رکھتا ہے۔ پوری ملت موحدا ان کی پوجا و پرستش میں مشغول ہے۔ پس قرآن کہتا ہے یہ سب کچھ جو تم کر رہے ہو، شرک ہے اور کفر ہے۔ یہ اس کی صفات میں ساجھی ٹھہرانا ہے، اور اس کی حاکمیت میں غیروں کو سہیم و حصہ دار بنانا ہے جس کا مٹانا قرآن کا اولین فرض ہے۔ غرضیکہ اسلام کسی ایسی اقتدار کو تسلیم نہیں کرتا جو شخصی ہو۔ یا کہ تنخواہ دار حاکموں کی ہو کر بھی ہو۔ وہ آزادی اور جمہوریت کا ایک مکمل نظام ہے۔ جو نوع انسانی کو اس سے چھنی ہوئی آزادی واپس دلانے کے لیے آیا تھا۔ یہ آزادی بادشاہوں اور اجنبی حکومتوں، خود غرض مذہبی پیشواؤں اور سوسائٹی کی طاقتوں اور جماعتوں نے غصب کر رکھی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ حق طاقت و غلبہ کا نام ہے لیکن اسلام نے ظاہر ہوتے ہی اعلان کیا کہ حق، طاقت نہیں ہے۔ بلکہ خود حق ہے اور خدا کے سوا کسی کو سزاوار نہیں کہ بندگان خدا کو اپنا محکوم اور غلام بنائے اس نے امتیاز اور بالادستی کے تمام قومی و نسلی مراتب بیک قلم مٹا دیئے۔ اور دنیا کو بتلا دیا کہ سب انسان درجہ میں برابر ہیں۔ اور سب کے حقوق برابر ہیں۔ نسل، قومیت اور رنگ معیار امتیاز نہیں ہے۔ بلکہ صرف عمل ہے اور سب سے بڑا وہی ہے جس کے کام سب سے اچھے ہوں۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط اس کا طرۂ امتیاز اور خصوصی نشان ہے انسانی حقوق کا یہ وہ اعلان ہے جو انقلاب فرانس سے گیارہ سو برس پہلے ہوا۔ یہ صرف اعلان ہی نہ تھا۔ بلکہ ایک عملی نظام تھا۔ جو مشہور مورخ گبن کے لفظوں میں اپنی کوئی مثال نہیں رکھتا۔ پیغمبر اسلام اس کے جانشینوں کی حکومت،

ایک مکمل جمہوریت تھی۔ اور صرف قوم کی رائے نیابت انتخاب سے اس کی بناوٹ ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی اصطلاح میں جیسے عمدہ اور جامع الفاظ اس مقصد کے لیے موجود ہیں، شاید ہی دنیا کی کسی زبان میں پائے جائیں اسلام نے پادشاہ کے اقتدار اور شخصیت سے انکار کیا ہے، وہ صرف ایک رئیس جمہوریت (پریزیڈنٹ آف ری پبلک) کا عہدہ جائز قرار دیتا ہے۔ لیکن اس کے لیے بھی خلیفہ کا لقب تجویز کیا گیا ہے۔ جس کے معنی ہیں نائب و جانشین کے۔ اس کا اقتدار محض نیابت قوم ہے اور بس، نیابت الٰہی تو ہر مسلمان بلکہ ہر انسان کو حاصل ہے۔ پس خلیفہ صرف قوم کا نائب و نمائندہ ہوتا ہے اور قوم خدا کی نائب، تو سب اقتدارات کا سرچشمہ وہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے خدائی خطابات و القاب کو کسی خلیفہ یا حاکم کے لئے استعمال کرنے کو شرک فی الصفات، قرار دیا اور اس کا نام اسمار پرستی رکھا۔ کلمات تعظیم و تبجیل عجیب و غریب القاب ہیں، جو ملوک و سلاطین عالم کے ناموں کے پہلے نظر آتے ہیں اور جن کے بغیر ذات شاہانہ کی طرف اشارہ کرنا بھی سوء ادب کی اخیر حد ہے۔ مگر مرقع خلافت اسلامیہ میں ان کی شکل ڈھونڈھنے سے کارہو گا۔ ایک ادنیٰ مسلمان آتا ہے اور یا ابوبکرؓ اور یا عمرؓ کہہ کر پکارتا ہے۔ اور خوشی سے جواب دیتے ہیں۔

زیادہ سے زیادہ جو الفاظ تعظیمی استعمال ہو سکتے ہیں وہ خلیفہ رسول اللہ اور امیر المومنین ہیں۔ جو مدح نہیں بلکہ واقعہ ہے۔ امراء و حکام ملک بھی انہیں الفاظ سے خلفاء کو خطاب کرتے تھے اور عوام اور غربا بھی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی یہی حالت تھی، آپ اپنے لئے تعظیمانہ و تمجید سننے کو پسند نہیں فرماتے تھے۔

ایک معمولی بدو آتا تھا اور یا محمدؐ کہہ کر خطاب کرتا تھا۔ ایک بار ایک بدوی حاضر ہوا اور ڈرتا ہوا خدمت نبویؐ میں آگے بڑھا تو آپ نے فرمایا تم مجھ سے ڈرتے ہو۔ میں اس ماں کا بیٹا ہوں جو تریدہ کھاتی تھی۔ سبحان اللہ ؂

چہ عظمت دادہ یا رب بخلق آن عظیم الشان
کہ انی عبدہٗ گوید بجائے قول سبحانی

ایک صحابی نے اپنے بیٹے کو خدمت نبویؐ میں بھیجنا چاہا۔ اس نے باپ سے پوچھا کہ اگر حضور اندر تشریف فرما ہوں تو میں کیوں کر آواز دوں۔ باپ نے کہا۔ جانِ پدر، کاشانۂ نبوت دربارِ قیصر و کسریٰ نہیں ہے حضورؐ کی ذات تجبر و تکبر سے پاک ہے، آپ اپنے جاں نثاروں سے تمرفع نہیں کرتے۔ تو یا محمدؐ کہہ کر پکارنا۔ سبحان اللہ کیا عالم تھا تربیت یافتگانِ نبوتی کا۔ کیا دنیا بھول گئی کہ مسلمانوں نے اپنے رسول صلعم اور خلفائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے ناموں سے پکارا اور اپنے خلفار کو بات بات پر ٹوکا۔ ان پر سخت اعتراض کیے۔ ان کو خطبہ دیتے ہوئے روک دیا اور اس وقت تک خطبہ نہیں دینے دیا جب تک خلیفہ اپنی صفائی نہیں پیش کر چکے۔ اپنے خلفار کو تلوار کی دھار اور نیزہ کی انی اور تیر کے پھل سے درست کرنے کی دھمکی دی۔ اور خلفار نے ان باتوں پر بجائے ناراض ہونے کے فخر کیا اور خوشی کا اظہار کرتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا کہ الحمد للہ ایسے حق گو امت میں موجود ہیں۔ لیکن اس کے مقابلے میں آج بادشاہوں اور ریاستوں کو چھوڑ کر صرف اپنی قوم کے ان لوگوں کو دیکھو جن کے پاس جائداد کا کوئی حصہ یا چاندی سونے کا کچھ حصہ جمع ہو گیا ہو۔ ان میں بہت سے لوگ دولت کی

تمام فضیلتوں کا منبع قرار دیتے ہیں، اور اس لیے لیڈر ہیں، پیشوائی کے مدعی ہیں۔
ان میں بہت سے فراعنہ اور نمارده تم کو ایسے ملیں گے۔ جن کا نام اگر ان خطابوں
سے الگ کر کے زبان سے نکالا جائے جو ان کے شیطانی جذبۂ غرور نے گھڑ لئے ہیں۔
یا حکومت کی خوشامد و غلامی کا اصطباغ لے کر حاصل کئے ہیں تو ان کے چہرے غضب
کے درندوں کی طرح خونخوار ہو جاتے ہیں۔ اور چارپایوں کی طرح ہیجان و غصہ
و غلاظت کو روک نہیں سکتے۔ ان بدترین نسل فراعنہ سے کوئی نہیں پوچھتا کہ
یہ کیا نمرودیت و فرعونیت و شیطانیت ہے۔ کیا ہے جس نے ان کے نفسوں کو
مغرور کر دیا ہے اور وہ کونسا ورثۂ عظمت و جلال ہے۔ جو تکبر اور غرور کی
طرح ان کو اپنے مورث اعلیٰ فرعون اور نمرود سے ملا ہے۔ اگر دولت کا گھمنڈ ہے
تو مجھے اس میں شک ہے کہ ان کے پاس جہل کی طرح دولت بھی کثیر ہے اور
اگر ان پرستاروں اور مصاحبوں کا انہیں غرور ہے جو غلامی اور دولت پرستی کے
کیڑے ہیں۔ تو میں یہ باور کرنے کے لئے کوئی وجہ نہیں پاتا کہ دنیا کے مغرور و
مستبد بادشاہوں سے بھی بڑھ کر اپنے پرستاروں اور غلاموں کا حلقہ ارد گرد
دیکھتے ہیں۔ بہرحال کچھ ہو مگر میری آواز کا ہر سامع آج انہیں ان کی ناکامی کا پیغام
پہنچا دے۔ اب ان کی تباہی و بربادی کا آخری وقت آگیا۔ وہ دنیا جس نے بحر احمر
میں فرعون اور اس کے ساتھیوں کو غرق ہوتے دیکھا تھا اور اس طرح کے ان گنت
تماشے ہزاروں دیکھ چکی ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ہندوستان کے اندر بحر حریت
و صداقت میں جس کی موجیں نہ صرف نام ہی میں بلکہ حقیقت میں بھی احمر ہوں گی۔
ان مغرور لیڈروں کے غرق ہونے کا تماشہ دیکھ لے گی وہ وقت دور نہیں جب

کہ ان کے اور ان کے مصاحبوں کے لئے آتش کدے تیار ہوں گے اور ان کی خاکستر کو تند و تیز ہوا کے جھونکوں میں اڑتے دنیا دیکھے گی۔

آج ارض و سما، بحر و بر اور فضائے آسمانی و خلائے آسمانی میں ان کی ہلاکت و بربادی کی آندھیاں چل رہی ہیں اور مرد مومن کی چشم بصیرت کو یہ تماشہ انقلاب امم و استبدال دُوَل و اقوام کا نظر آرہا ہے۔ اس کی آنکھیں وہ سب کچھ دیکھ رہی ہیں جو ان کی بربادی و تباہی کا سامان ہو رہا ہے۔ آج کی رفتار، دریا کی روانی، لیل و نہار کی گردش، اقوام و ملل کے تغیرات، گردش زمانہ کی حرکت افراد و اشخاص کے نفسیاتی تموّل پر مبنی اذہان و قلوب کے میلانات، طبائع انسانی کے رجحانات، یہ سب بتا رہے ہیں نمارود و فراعنۂ دورِ حاضر کی ہلاکت و خلاکت تباہی و بربادی خسران و مقہوریت کا وقت بالکل قریب آچکا ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب کہ ان کی دولت و مال، عزّ و جاہ کے جنازے نکلیں گے اور یہ صفحۂ ہستی سے یوں مٹائے جائیں گے کہ تاریخ عالم میں ان کے افسانے رہ جائیں گے اور نام و نشان باقی نہ رہیں گے۔ ان کی اس تباہی و بربادی پر کوئی نوحہ و ماتم کرنے والا نہ ہوگا۔ نہ زمین ان پر ترس کھائے گی اور نہ ہی آسمان روئے گا۔

فَمَا بَکَتْ عَلَیْھِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا کَانُوْا مُنْظَرِیْنَ ط

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ۔ لوگ دنیا میں سینکڑوں قوتوں کے محکوم ہیں، ماں باپ کے محکوم ہیں، دوست احباب کے محکوم ہیں۔ استاد و مرشد کے محکوم ہیں۔ امیروں، حاکموں اور بادشاہوں کے محکوم ہیں۔ اگرچہ وہ دنیا میں بغیر کسی زنجیر اور بیڑی کے آئے تھے، مگر دنیا نے ان کے پاؤں میں بہت سی بیڑیاں ڈال دی ہیں۔

لیکن مومن و مسلم ہستی وہ ہے جو صرف ایک ہی کی محکوم ہے، اس کے گلے میں محکومی کی ایک بوجھل زنجیر ضرور ہے۔ پر مختلف سمتوں میں کھینچنے والی بہت سی ہلکی زنجیریں نہیں ہیں۔ وہ ماں باپ کی اطاعت اور فرماں برداری کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے ایک ہی حاکم نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہ دوستوں سے محبت رکھتا ہے کیونکہ اسے رفیقوں اور ساتھیوں کے ساتھ اچھے برتاؤ کی تلقین کی گئی ہے۔ وہ اپنے سے ہر بزرگ اور ہر تجربے کا ادب ملحوظ رکھتا ہے کیونکہ اس کے ادب آموزِ حقیقی نے ایسے ہی بتایا ہے، وہ بادشاہوں اور حاکموں کا حکم بھی مانتا ہے۔ کیونکہ حاکموں کے ایسے حکموں کے ماننے سے اسے نہیں روکا گیا ہے۔ جو اس کے حاکم حقیقی کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ وہ دنیا کے ایسے بادشاہوں کی اطاعت کرتا ہے جو اس کی آسمانی بادشاہت کی اطاعت کرتے ہیں کیونکہ اسے تعلیم دی گئی ہے کہ وہ ہمیشہ ہی ایسا کرے۔ لیکن یہ سب کچھ جو وہ کرتا ہے تو اس لئے نہیں کرتا کہ ان سب کے اندر کوئی حکم ماننا اور ان کو جھکنے کی جگہ سمجھتا ہے۔ بلکہ صرف اس لئے کہ اطاعت ایک ہی کے لئے ہے اور حکم صرف ایک ہی کا ہے۔ جب اس ایک ہی حکم دینے والے نے ان سب باتوں کا حکم دے دیا تو ضرور ہے کہ خدا کے لئے ان سب بندوں کو بھی مانا جائے اور اللہ کی اطاعت کی خاطر وہ اس کے بندوں کا بھی مطیع ہو جائے۔

پس فی الحقیقت دنیا میں ہر انسان کے لئے بے شمار حاکم اور بہت سی جھکانے والی قوتیں ہیں۔ لیکن مومن کے لئے صرف ایک ہی ہے، اس کے سوا کوئی نہیں وہ صرف اسی کے آگے جھکتا ہے۔ اور صرف اسی کو مانتا ہے، اس کی اطاعت

کا حق ایک ہی کو ہے۔ اس کی پیشانی کے جھکنے کی چوکھٹ ایک ہی ہے۔ اور اس کے دل کی خریداری کے لئے بھی ایک ہی ہے۔ وہ اگر دنیا میں کسی دوسری ہستی کی اطاعت کرتا بھی ہے تو صرف اسی ایک کے لیے۔ اس لئے اس کی بہت سی اطاعتیں بھی اسی ایک ہی اطاعت میں شامل ہو جاتی ہیں۔

مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

حضرت یوسف علیہ السلام نے قید خانے میں اپنے ساتھیوں سے کیا پوچھا تھا۔

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَہَّارُ ؕ

(ترجمہ) بہت سے معبود بنا لینا بہتر ہے یا ایک ہی قہار و مقتدر خدا کو پوجنا۔

یہی خلاصہ ایمان و اسلام ہے جس کی ہر مومن و مسلم کو قرآن کریم نے تعلیم دی ہے کہ: اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ ؕ (ترجمہ) تمام جہان میں اللہ کے سوا اور کوئی نہیں جس کی حکومت ہو، اس نے ہمیں حکم دیا ہے کہ اس کے سوا اور کسی کو نہ پوجیں اور نہ کسی کو اپنا معبود بنائیں۔ یہی دین قیم ہے جس کی پیروی کا حکم دیا گیا۔

ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ؕ حدیث صحیح یہ ہے کہ فرمایا: لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ. جس بات کے ماننے میں خدا کی نافرمانی ہو اس میں کسی بندے کی فرمانبرداری نہ کرو۔

اسلام نے یہ کہہ کر فی الحقیقت ان تمام ماسوی اللہ اطاعتوں اور فرمانبرداریوں کی بندشوں سے مومنوں کو آزادی کامل کر دیا جن کی بیڑیوں سے تمام انسانوں کے پاؤں بوجھل ہو رہے تھے۔ اور اس کے ایک ہی جملہ میں انسانی اطاعت اور پیروی

کی حیثیت اس وسعت اور احاطہ کے ساتھ سمجھادی کہ اس کے بعد اور کچھ باقی نہ رہا۔
یہی ہے جو اسلامی زندگی کا دستور العمل ہے اور یہی ہے جو مومن کے تمام اعمال و اعتقادات کی ایک مکمل تصویر ہے، اس تعلیم الٰہی نے بتلا دیا ہے کہ جتنی اطاعتیں جتنی فرمانبرداریاں جتنی وفاداریاں اور جس قدر بھی تسلیم و اعتراف ہے، صرف اس وقت کے لیے ہے جب تک کہ بندے کی بات ماننے سے خدا کی بات نہ جاتی ہو اور دنیا والوں کے وفادار بننے سے خدا کی حکومت کے آگے بغاوت نہ ہوتی ہو۔ لیکن اگر کبھی ایسی صورت پیش آجائے کہ اللہ اور اس کے بندوں کے احکام میں مقابلہ آپڑے تو پھر تمام اطاعتوں کا خاتمہ، تمام عہدوں اور شرطوں کی شکست تمام رشتوں اور ناطوں کا انقطاع اور تمام دوستوں اور محبتوں کا اختتام ہے۔ اس وقت نہ تو حاکم حاکم ہے نہ پادشاہ پادشاہ۔ نہ باپ، باپ ہے۔ نہ بھائی بھائی۔ سب کے آگے تمرّد، سب کے ساتھ انکار، سب کے سامنے سرکشی، سب کے ساتھ بغاوت پہلے جس قدر نرمی تھی اتنی ہی اب سختی چاہیے۔ پہلے جس قدر اعتراف تھا۔ اتنا ہی اب تمرّد چاہیے پہلے جس قدر جھکاؤ تھا اتنا ہی اب غرور ہو، کیونکہ رشتے کٹ گئے اور عہد توڑ ڈالے گئے۔ رشتہ دار دراصل ایک ہی تھا۔ اور یہ سب رشتے اسی ایک رشتے کی خاطر تھے۔ حکم ایک ہی کا تھا۔ اور یہ سب اطاعتیں اسی ایک کی اطاعت کے لیے تھیں۔ جب اس کے ماننے میں اس سے انکار اور ان کی وفاداری میں اسی سے بغاوت ہونے لگی۔ تو جس کے حکم سے رشتہ جوڑا تھا۔ اسی کی تلوار نے کاٹ بھی دیا۔ اور جس کے ہاتھ نے ملایا تھا اسی کے ہاتھ نے الگ بھی کر دیا۔ کہ

لَاطَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِی مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ۔

سرورِ کائنات اور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بڑھ کر مسلمانوں کا کون آقا ہو سکتا ہے؟ لیکن خود اس نے بھی جب عقبہ میں انصار سے بیعت لی تو فرمایا۔

وَالطَّاعَةُ فِي مَعْرُوْفٍ ۔ میری اطاعت تم پر اسی وقت تک کے لئے واجب ہے جب تک کہ میں تم کو نیکی کا حکم دوں، جب اس شہنشاہ کونین کی اطاعت مسلمانوں پر نیکی و معروف کے ساتھ مشروط ہے تو پھر دنیا میں کون پادشاہ کون سی حکومت۔ کون سے پیشوا، کون سے رہنما اور کون سی قوتیں ایسی ہو سکتی ہیں جن کی اطاعت ظلم و عدوان کے بعد بھی ہمارے لئے باقی رہے۔

آدم علیہ السلام کی اولاد دو کی محکوم نہیں ہو سکتی۔ وہ ایک سے ملے گی۔ دوسرے کو چھوڑ دے گی۔ ایک سے جڑے گی۔ دوسرے سے کٹے گی۔ پھر خدارا مجھے بتاؤ کہ ایک مومن کس کو چھوڑے گا۔ اور کس سے ملے گا۔ ایک ملک کے دو بادشاہ نہیں ہو سکتے ایک باقی رہے گا ایک کو چھوڑنا پڑے گا۔ پھر مجھے بتلاؤ کہ مومن کی اقلیم دل کس کی پادشاہت قبول کرے گی کیا وہ اس سے ملے گا جس کی حالت یہ ہے کہ

وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ

خدا نے جس کے جوڑنے اور ملانے کا حکم دیا ہے وہ اسے توڑتے اور جدا کرتے ہیں۔

کیا اس کی پادشاہت قبول کرے گا جس کی حالت کی تصویر یہ ہے۔

وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ط

وہ دنیا میں فتنہ اور فساد پھیلاتے ہیں اور انجام کار وہی ناکام و نامراد رہیں گے

اور کیا اس کی بادشاہت سے گردن موڑے گا جو پکارتا ہے کہ

یَا اَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ ط

اے غافل انسان! کیا ہے جس کے گھمنڈ نے تجھے اپنے مہربان اور پالنے والے آقا سے سرکش بنا دیا ہے۔

مگر آہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَکُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ط

تم اس شہنشاہ حقیقی کی حکومت سے کیونکر انکار کرو گے جس نے تمہیں اس وقت زندہ کیا۔ جب کہ تم مردہ تھے۔ اور تم پر پھر موت طاری کرے گا۔ اس کے بعد دوبارہ زندگی بخشے گا پھر تم سب اسی کے پاس بلا لیے جاؤ گے۔

دنیا اور اس کی بادشاہیاں فانی ہیں۔ ان کے جبروت وجلال کو ایک دن مٹنا ہے خدائے منتقم وقہار کے بھیجے ہوئے فرشتہ پائے عذاب، انقلاب وتغیرات کے حربے لے کر اترنے والے ہیں۔ ان کے قلعے مسمار ہو جائیں گے۔ ان کی تلواریں کند ہو جائیں گی۔ ان کی فوجیں ہلاک ہو جائیں گی۔ ان کی توپیں ان کو پناہ نہ دیں گی۔ ان کے خزانے ان کے کام نہ آئیں گے۔ ان کی طاقتیں نیست ونابود کر دی جائیں گی۔ ان کا تاج غرور ان کے سر سے اتر جائے گا۔ ان کا تخت جلال وعظمت واژگون نظر آئے گا۔

وَیَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَاءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰئِکَۃُ تَنْزِیْلًا ۝ اَلْمُلْکُ یَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ وَکَانَ یَوْمًا عَلَی الْکَافِرِیْنَ عَسِیْرًا ط

اور جس دن آسمان ایک بادل کے ٹکڑے پر سے پھٹ جائے گا۔ اور اس بادل کے اندر سے فرشتے جوق جوق اتارے جائیں گے۔ اس دن کسی کی بادشاہت باقی نہ رہے گی۔ صرف خدائے رحمان ہی کی حکومت ہو گی اور یاد رکھو کہ وہ دن کافروں کے لئے بہت ہی سخت ہو گا۔

پھر اُس دن جب کہ رب الافواج اپنے ہزاروں قدوسیوں کے ساتھ نمودار ہو گا۔ اور ملکوت السموات والارض کا نقیب پکارے گا۔

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ط

آج کے دن کس کی بادشاہی ہے۔ کسی کی نہیں۔ صرف خدائے واحد قہار کی۔

تو اس وقت کیا عالم ہو گا۔ ان انسانوں کا جنہوں نے پادشاہ ارض و سما کو چھوڑ کر مٹی کے تودوں کو اپنا بادشاہ بنا لیا ہے اور ان کے حکموں کی اطاعت کو خدا کے حکموں کی اطاعت پر ترجیح دیتے ہیں۔

آہ اس دن وہ کہاں جائیں گے۔ جنہوں نے انسانوں سے صلح کرنے کے لئے خدا سے جنگ کی۔ اور اپنے اس ایک ہی آقا کو ہمیشہ اپنے سے روٹھا ہوا رکھا۔ وہ پکاریں گے۔ پر جواب نہ دیا جائے گا۔ وہ فریاد کریں گے۔ پر سنی نہ جائے گی۔ وہ توبہ کریں گے پر قبول نہ ہو گی۔ وہ نادم ہوں گے پر ندامت کام نہ دیگی۔

اے انسان اس دن کے لئے تجھ پر افسوس ہے۔ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ط
وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ

ان سے کہا جائے گا کہ اب اپنے خداوندوں اور حاکموں کو پکارو۔ جن کو تم خدا کی طرح مانتے تھے اور خدا کی طرح ان سے ڈرتے۔ وہ پکاریں گے پر کچھ جواب نہ پائیں گے۔

پس وہ معلم الٰہی۔ وہ داعی ربانی، وہ مبشر، وہ منذر، وہ رحمۃ اللعالمین، وہ محبوب رب العالمین، وہ سلطان کونین، آگے بڑھے گا، اور حضور خداوندی میں عرض کرے گا۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا ؕ

اے پروردگار! افسوس ہے کہ میری امت نے قرآن کی ہدایتوں اور تعلیموں پر عمل نہ کیا اور اس سے اپنا رشتہ کاٹ لیا۔ اس کا یہ نتیجہ جو وہ آج بھگت رہے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ ؕ

پس سفر سے پہلے زاد راہ کی فکر کر لو۔ اور طوفان سے پہلے کشتی بنا لو کیونکہ سفر نزدیک تر ہے اور طوفان کے آثار ظاہر ہو گئے ہیں۔ جن کے پاس زاد راہ نہ ہو گا۔ وہ بھوکے مریں گے۔ اور جن کے پاس کشتی نہ ہو گی وہ سیلاب میں غرق ہو جائیں گے۔ جب تم دیکھتے ہو کہ مطلع غبار آلود ہوا اور دن کی روشنی بدلیوں میں چھپ گئی۔ تو تم سمجھتے ہو کہ برق و باراں کا وقت آ گیا پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ دنیا کی امن و سلامتی کا مطلع، غبار آلود ہو رہا ہے۔ دین الٰہی کی روشنی ظلمت و کفر و طغیان میں چھپ رہی ہے مگر تم یقین نہیں کرتے کہ موسم بدلنے والا ہے اور تیار نہیں ہوتے کہ انسانی بادشاہتوں سے کٹ کر خدا کی بادشاہت کے مطیع ہو جاؤ۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ خدا کے تخت و جلال کی منادی پھر بلند ہو اور اس کی زمین صرف اسی کے لئے ہو جائے۔

حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ ؕ

آہ! ہم بہت سو چکے اور غفلت و سرشاری کی انتہا ہو چکی ہم نے اپنے خالق

سے ہمیشہ غرور کیا لیکن مخلوقوں کے سامنے کبھی بھی فروتنی سے نہ شرمائے ہمارا وصف یہ بتلایا گیا تھا کہ :۔

اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُوْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکَافِرِیْنَ ط

مومنوں کے ساتھ نہایت عاجز و نرم، مگر کافروں کے مقابلہ میں نہایت مغرور و سخت۔ ہمارے اسلاف کرام کی یہ تعریف کی گئی تھی کہ

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ ط

کافروں کے لئے نہایت سخت ہیں، پر آپس میں نہایت رحم والے اور مہربان پھر ہم نے اپنی تمام خوبیاں گنوا دیں۔ اور دنیا کی مغضوب قوموں کی تمام برائیاں سیکھ لیں، ہم اپنوں کے آگے سرکش ہو گئے اور غیروں کے سامنے ذلت سے جھکنے لگ گئے، ہم نے اپنے پروردگار کے سامنے دست سوال نہیں بڑھایا۔ لیکن بندوں کے دسترخوان سے گرے ہوئے ٹکڑے چننے لگے۔ ہم نے شہنشاہ ارض و سما کی خداوندی سے نافرمانی کی مگر زمین کے چند جزیروں کے مالکوں کو اپنا خداوند سمجھ لیا۔ ہم پورے دن میں ایک بار بھی خدا کا نام ہیبت اور خوف کے ساتھ نہیں لیتے۔ پر سینکڑوں مرتبہ اپنے غیر مسلم حاکموں کے تصور سے لرزتے اور کانپتے رہتے ہیں۔

یٰاَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ الَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ فِیْ اَیِّ صُوْرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ کَلَّا بَلْ تُکَذِّبُوْنَ بِالدِّیْنِ ۝ وَاِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ ۝ کِرَامًا کَاتِبِیْنَ یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ۝ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ یَصْلَوْنَھَا

يَوْمَ الدِّيْنِ ۝ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِيْنَ ۝ وَمَا اَدْرَاكَ مَا يَوْمُ
الدِّيْنِ ۝ ثُمَّ مَا اَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ
لِنَفْسٍ شَيْئًا ۝ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلّٰهِ ۝

اے سرکش انسان! کس چیز نے تجھے اپنے مہربان اور محبت کرنے والے پروردگار کی جانب میں گستاخ کر دیا ہے۔ وہ کہ اس نے تجھے پیدا کیا۔ تیری ساخت درست کی، خلقت کو اعتدال بخشا۔ اور جس صورت میں چاہا تیری شکل کی ترکیب کی۔ پھر یہ کس کی وفاداری ہے جس نے تجھے اس سے باغی بنا دیا ہے۔ نہیں اصل یہ ہے کہ تمہیں اس کی حکومت کا یقین ہی نہیں ہے۔ حالانکہ تجھ پر اس کی طرف سے ایسے بزرگ نگراں کار متعین ہیں جو تمہارے اعمال کا ہر آن احتساب کرتے ہیں۔ اور تمہارا کوئی فعل بھی ان کی نظر سے مخفی نہیں۔ یاد رکھو کہ ہم نے ناکامی اور کامیابی کی ایک تقسیم کر دی ہے۔ خدا کے اطاعت گذار بندے عزت و مراد اور فتح و کامرانی کے عیش و نشاط میں مبتلا ہوں گے۔ جس سے کبھی نہ نکل سکیں گے۔ یہ خدا کی پادشاہی کا دن کیا ہے۔ وہ دن جس میں کوئی کسی کے لیے کچھ نہ کر سکے گا۔ اور صرف خدا کی اس دن حکومت ہوگی۔

اس سے پہلے کہ خدا کی پادشاہی کا دن نزدیک آئے کیا بہتر نہیں کہ اس کے لیے ہم اپنے تئیں تیار کر لیں۔ تاکہ جب اس کا مقدس دن آئے تو ہم یہ کہہ کر نکال دیے جائیں کہ تم نے غیروں کی حکومت کے آگے خدا کی حکومت کو بھلا دیا تھا۔ جاؤ کہ آج خدا کی بادشاہت میں بھی تم بالکل بھلا دیئے گئے ہو۔

لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ ۝ وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسَاكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ

لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَاْوٰكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ○ ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ○

اور اس وقت ان سب سے کہا جائے گا کہ جس طرح تم نے اس دن کی حکومت الٰہی کو بھلا دیا تھا آج ہم بھی تم کو بھلا دیں گے۔ تمہارا ٹھکانا آگ کے شعلے ہیں۔ اور کوئی نہیں جو تمہارا مددگار ہو۔ یہ اس کی سزا ہے کہ تم نے خدا کی آیتوں کی ہنسی اڑائی، اور دنیا کی زندگی اور اس کے کاموں نے تمہیں دھوکے میں ڈال رکھا۔ پس آج نہ تو عذاب سے تم نکالے جاؤ گے۔ اور نہ ہی تمہیں اس کا موقع ملے گا۔ کہ توبہ کر کے خدا کو منا لو۔ کیونکہ اس کا وقت تم نے کھو دیا۔

آج خدا کی حکومت اور انسانی بادشاہتوں میں ایک سخت جنگ بپا ہے۔ شیطان کا تخت زمین کے سب سے بڑے خطے پر بچھا دیا گیا ہے۔ اس کے گھرانے کی وراثت اس کے پوجنے والوں میں تقسیم کر دی گئی ہے۔ اور دجال کی فوج ہر طرف پھیل گئی ہے۔ یہ شیطانی بادشاہتیں چاہتی ہیں کہ خدا کی حکومت کو نیست و نابود کر دیں۔ ان کے داہنی جانب، دنیوی لذتوں اور عزتوں کی ایک ساحرانہ جنت ہے اور بائیں جانب جسمانی تکلیفوں اور عقوبتوں کی ایک دکھائی دینے والی جہنم بھڑک رہی ہے۔ جو فرزند آدم خدا کی بادشاہت سے انکار کرتا ہے یہ دجال کفر و ظلمت اس پر اپنے جادو کی جنت کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔ کہ حق پرستوں کی نظر میں فی الحقیقت خدا کی لعنت اور پھٹکار کی جہنم ہے۔

لٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ○ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا

اور جو خدا کی بادشاہت کا اقرار کرتے ہیں، ان کو اپنی ابلیسی عقوبتوں اور جسمانی سزاؤں کی جہنم میں دھکیل دیتے ہیں۔ کہ

حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ ط مگر فی الحقیقت سچائی کے عاشقوں اور راست بازی کے پرستاروں کے لیئے وہ جہنم جہنم نہیں ہے۔ لذتوں اور راحتوں کی ایک جنت النعیم ہے کیونکہ ان کے لسان و ایقان کی صدا یہ ہے کہ

فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ط اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ط

اے دنیوی سزاؤں کی طاقت پر مغرور ہونے والے بادشاہ! تو جو کچھ کرنے والا ہے کر گزر۔ تو صرف دنیا کی اس زندگی اور گوشت اور خون کے جسم پر ہی حکم چلا سکتا ہے۔ پس چلا دیکھ۔ ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لاچکے ہیں۔ تاکہ ہماری خطاؤں کو معاف کرے تیری دنیاوی سزائیں ہمیں اس کی راہ سے باز نہیں رکھ سکتیں۔

جب یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور زمین کے ایک خاص ٹکڑے ہی میں نہیں بلکہ اس کے ہر گوشے میں آج یہی مقابلہ جاری ہے۔ تو بتلاؤ پرستاران دین حنیفی ان دجاجلہ کفر و شیطنت اور اس حکومت دام الٰہی میں سے کس کا ساتھ دیں گے۔ کیا ان کو اس آگ کے شعلوں کا ڈر ہے جو دجال کی حکومت اپنے ساتھ ساتھ سلگاتی آتی ہے لیکن کیا ان کو معلوم نہیں کہ ان کا مورث اعلیٰ کون تھا۔ دین حنیفیت کے اولین داعی نے بابل کی ایک السیوری سرکش حکومت کے مقابلے میں خدا کی حکومت کو ترجیح دی اور اسے آگ میں ڈالنے کے لیئے شعلے بھڑکائے گئے پر اس کی نظر میں ہلاکت کے وہ شعلے گلزار بہشت کے شگفتہ پھول تھے۔ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ

کیا ان کے دل میں دنیوی لذتوں اور عزتوں کی اس جھوٹی جنت کی طمع پیدا ہو گئی ہے۔ جس کے فریب باطل سے جنود شیطانی، انسانی روح کو فتنہ میں ڈالنا چاہتی ہے۔ اگر ایسا ہے تو کیا انہیں خبر نہیں کہ مصر کا بادشاہ نبوت الٰہی کا منکر ہو کر، اپنی عظیم الشان گاڑیوں اور بڑی بڑی رتھوں سے اور اس ملک سے جس پر اسے رب الاعلیٰ ہونے کا گھمنڈ تھا۔ کتنے دن متمتع ہو سکا۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ
طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيِيْ نِسَآءَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ
الْمُفْسِدِيْنَ ط وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ
وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ
وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ

فرعون ارض مصر میں بہت ہی بڑھ چڑھ کر نکلا تھا۔ اس نے ملک کے باشندوں میں تفریق کر کے الگ الگ گروہ قرار دے رکھے تھے۔ ان میں سے ایک گروہ بنی اسرائیل کو اس قدر کم زور اور بے بس سمجھ رکھا تھا کہ ان کے فرزندوں کو قتل کرتا اور ان کے اغراض و ناموس کو برباد کرتا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ زمین کے مفسدوں میں سے بڑا ہی مفسد تھا لیکن با ایں ہمہ ہمارا فیصلہ یہ تھا کہ جو قوم اس کے ملک میں سب سے زیادہ کم زور سمجھی گئی تھی۔ اس پر احسان کریں، اس قوم کے لوگوں کو وہاں کی سرداری و ریاست بخشیں۔ انہی کو وہاں کی سلطنت کا وارث بنائیں اور انہی کی حکومت کو تمام ملک میں قائم کرا دیں، اس کے لشکر کو جس ضعیف قوم کی طرف سے بغاوت و خروج کا کھٹکا لگا رہتا تھا اسی کے ہاتھوں

ان کے ظلم و استبداد کے نتیجے ان کے آگے آئیں۔

مسلمانو! کیا متاعِ آخرت بیچ کر دنیا کے چند خزف ریزوں پر قناعت کی خواہش ہے؟ کیا اللہ کی حکومت سے بغاوت لے کر دنیا کی حکومتوں سے صلح کرنے کا ارادہ ہے؟ کیا نقدِ حیاتِ ابدی بیچ کر معیشتِ چند روزہ کا سامان کر رہے ہو۔ کیا تمہیں یقین نہیں کہ۔

مَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَّاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ط

یہ دنیا کی زندگی جو تعلقِ الٰہی سے خالی ہے۔ اس کے سوا اور کیا ہے کہ فانی خواہشوں کے بہانے کا ایک کھیل ہے۔ اصل زندگی تو آخرت ہی کی زندگی ہے۔ جس کے لئے اس زندگی کو تیار کرنا چاہیئے۔

اگر تم صرف دنیا ہی کے طالب ہو، جب بھی اپنے خدا کو نہ چھوڑو۔ کیونکہ وہ دنیا آخرت دونوں بخشنے کے لئے تیار ہے۔ تم کیوں صرف ایک ہی پر قناعت کرتے ہو۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ

اور جو شخص دنیا کی برتری کا طالب ہے اس سے کہہ دو کہ صرف دنیا ہی کے لئے کیوں ہلاک ہوتا ہے۔ حالانکہ خدا تو دنیا اور آخرت دونوں کی برتری دے سکتا ہے وہ خدا کے پاس آئے اور آخرت کے ساتھ دنیا کو بھی لے۔

مسلمانو! پکارنے والا پکار رہا ہے کہ اب بھی خدائے قدوس کی سرکشی و نافرمانی سے باز آجاؤ۔

اور پادشاہِ ارض وسما کو اپنے سے روٹھا ہوا نہ چھوڑو۔ جس کے روٹھنے کے بعد زمین و آسمان کی کوئی ہستی بھی تم سے مُنہ نہیں سکتی۔ اس سے بغاوت نہ کرو۔ جب کہ دنیا کی تمام طاقتوں سے باغی ہو کر صرف اسی کے وفادار ہو جاؤ۔ پھر کوئی ہے جو اس آواز پر کان دھرے۔

فَهَلْ مِنْ مُّسْتَمِعٍ ط

آسمانی بادشاہت کے ملائکہ مکرمین اور قدوسیانِ مقربین اپنے نورانی پروں کو پھیلائے ہوئے اس راست باز روح کو ڈھونڈ رہے ہیں جو مخلوق کی بادشاہت چھوڑ کر خالق کی حکومت میں بسنا چاہتی ہے۔ کون ہے جو اس پاک مسکن کا طالب ہو اور پاک آرزوؤں کی طرح پکار اٹھے۔

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ط رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ط

اے ہمارے حقیقی پادشاہ! ہم نے ایک پکارنے والے کی آواز سنی جو تیری بادشاہت کی آواز دے رہا تھا۔ اے ہمارے ایک ہی بادشاہ! ہم نے تیری بادشاہت قبول کی۔ بس ہمارے گناہ معاف کر، ہمارے عیوب پر پردہ ڈال، اپنے نیک بندوں کی معیت میں ہمارا خاتمہ کر۔ تو نے اپنے منادی کرنے والے کی زبانی ہم سے جو وعدے کیے تھے وہ پورے کر۔ اور اپنی آخری پادشاہت میں ہمیں ذلیل و خوار نہ کر۔ کہ تو اپنے وعدوں سے کبھی نہیں ٹلتا۔

عروج و زوال کے فطری اصول

تم کرۂ ارض کی کوئی قول لے لو اور زمین کا کوئی ایک قطعہ سامنے رکھ لو اور جس وقت سے اس کی تاریخ میں روشنی آئی ہے۔ اس کے حالات کا کھوج لگاؤ تو تم دیکھو گے۔ کہ اس کی پوری تاریخ کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ارث و میراث کی ایک مسلسل داستان ہے۔ ایک قوم قابض ہوئی پھر مٹ گئی۔ دوسری وارث ہو گئی۔ پھر اس کے لئے بھی مٹنا ہوا اور تیسرے وارث کے لئے جگہ خالی ہو گئی۔ وَھَلُمَّ جَرًا۔ قرآن کہتا ہے یہاں ارث و میراث کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اب سوچنا یہ چاہیئے کہ جو ورثہ چھوڑنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کیوں ہوتے ہیں اور جو وارث ہوتے ہیں کیوں وراثت کے حقدار ہو جاتے ہیں۔ فرمایا اس لئے کہ یہاں خدا کا ایک اٹل قانون کام کر رہا ہے کہ۔

أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ط

کہ زمین کے وارث خدا کے نیک بندے ہوتے ہیں۔

یعنی جماعتوں اور قوموں کے لئے، یہاں بھی یہ قانون کام کر رہا ہے کہ انہی لوگوں کے حصہ میں ملک کی فرماں روائی آتی ہے۔ جو نیک ہوتے ہیں اور صالح ہوتے ہیں صلح کے معنی، سنورنے سنوارنے کے ہیں۔ خسر کے معنی بگڑنے بگاڑنے کے ہیں۔ صالح انسان وہ ہے جو اپنے کو سنوار لیتا ہے۔ اور دوسرے کو سنوارنے کی استعداد پیدا کرتا ہے۔ اور یہی حقیقت بد عملی کی ہے۔ پس قانون یہ ہوا کہ زمین کی وراثت سنورنے اور سنوارنے والوں کی وراثت میں آتی ہے۔ ان کی وراثت میں نہیں جو اپنے اعتقاد و عمل میں بگڑ جاتے ہیں۔ اور سنوارنے کی جگہ بگاڑنے والے بن جاتے ہیں۔

تورات اور انجیل اور قرآن تینوں نے وراثت ارض کی ترکیب جابجا استعمال کی ہے اور غور کرو یہ ترکیب صورت حال کی کتنی سچی اور قطعی تعبیر ہے۔ دنیا کے ہر گوشے میں ہم دیکھتے ہیں، ایک طرح کی بدلتی ہوئی میراث کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ یعنی ایک فرد اور ایک گروہ طاقت و اقتدار حاصل کرتا ہے۔ پھر وہ چلا جاتا ہے۔ اور دوسرا فرد اور گروہ اس کی ساری چیزوں کا وارث ہو جاتا ہے۔ حکومتیں کیا ہیں، محض ایک ورثہ ہیں۔ جو ایک گروہ سے نکلتا ہے اور دوسرے گروہ کے حصہ میں آجاتا ہے۔ پس قرآن کہتا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ اس لئے کہ وراثت ارض کی شرط کی اصلاح و صلاحیت ہے۔ جو صالح نہ رہے ان سے نکل جائے گی جو صالح رہے ہوں گے ان کے ورثہ میں آئے گی۔

لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰہِ تَحْوِیْلًا ط

سورہ رعد میں فرمایا۔ یہ جو کچھ بھی ہے، حق اور باطل کی آویزش۔ لیکن حق

اور باطل کی حقیقت کیا ہے۔ کون سا قانون ہے جو اس کے اندر کام کر رہا ہے۔ یہاں واضح کیا ہے کہ یہ بقاء انفع کا قانون ہے۔ لیکن وہ کبھی لفظ انفع کی بجائے لفظ اصلح استعمال کرتا ہے۔ لفظ دو ہیں، معنی ایک ہے، یعنی اللہ نے قانون ہستی کے قیام و اصلاح کے لئے یہ قانون ٹھہرا دیا ہے کہ یہاں وہ چیز باقی رہ سکتی ہے جس میں نفع ہو۔ جس میں نفع نہیں وہ نہیں ٹھہر سکتی۔ اسے نابود ہو جانا ہے۔ کیونکہ کائنات ہستی کا یہ بناؤ، یہ حسن، یہ ارتقا قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر اس میں خوبی کی بقا اور خرابی کے ازالے کے لئے ایک اٹل قوت سرگرم کار نہ رہتی ہو یہ قوت کیا ہے۔ فطرت کا انتخاب ہے۔ فطرت ہمیشہ چھانٹتی رہتی ہے۔ وہ ہر گوشہ میں صرف خوبی اور برتری ہی باقی رکھتی ہے۔ فساد اور نقص محو کر دیتی ہے۔ ہم فطرت کے اس انتخاب سے بے خبر نہیں ہیں۔ قرآن کہتا ہے۔ اس کارگاہِ فیضان و جمال میں، صرف وہی چیز باقی رکھی جاتی ہے۔ جس میں نفع ہو۔ کیونکہ یہاں رحمت کارفرما ہے اور رحمت چاہتی ہے کہ افادہ و فیضان ہو۔ وہ نقصان گوارا نہیں کر سکتی۔ وہ کہتا ہے، جس طرح تم مادیات میں دیکھتے ہو کہ فطرت چھانٹتی ہے۔ جو چیز نافع ہوتی ہے، اسے باقی رکھتی ہے اور جو نافع نہیں ہوتی اسے محو کر دیتی ہے۔ ٹھیک ٹھیک عمل ایسا ہی معنویات میں بھی جاری ہے جو عمل حق ہوگا قائم اور ثابت رہے گا۔ جو باطل ہوگا مٹ جائے گا۔ اور جب کبھی حق و باطل کا مقابلہ ہوگا۔ تو بقا حق کے لئے ہوگی نہ کہ باطل کے لئے وہ اسی کو قضاء بالحق سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی فطرت کا فیصلہ حق جو باطل کے لئے نہیں ہو سکتا۔

فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰہِ قُضِیَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ ھُنَالِکَ الْمُبْطِلُوْنَ ط

یعنی جب فیصلہ کا وقت آگیا تو فیصلہ حق نافذ کیا گیا۔ اور باطل پرست تباہ و برباد کیے گئے۔ وہ کہتا ہے' اس قانون سے تم کیونکر منکر ہو سکتے ہو۔ جب کہ زمین و آسمان کا تمام کارخانہ اسی کی کارفرمائیوں پر قائم ہے۔ اگر فطرتِ کائنات' برائی اور نقصان چھانٹتی نہ رہتی اور نکھار اور قیام' صرف اچھائی اور خوبی کے لیے نہ ہوتا تو تمام کارخانۂ ہستی درہم برہم ہو جاتا۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ط

یعنی اگر قانون ان کی خواہشوں کی پیروی کرنے لگے تو یقین کرو کہ یہ زمین، آسمان اور جو کچھ اس میں ہے' سب درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ وہ کہتا ہے' امم و ملل' اقوام و جماعات کا اقبال و ادبار' ہدایت و شقاوت کا معاملہ بھی' اسی قانون سے وابستہ ہے۔ وہ اس سے مستثنیٰ نہیں' یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جو قانون کارخانۂ ہستی کے ہر گوشہ اور ہر ذرہ میں اپنا عمل کر رہا ہے۔ وہ یہاں آکر بے کار ہو جائے۔ جس قانون کی وسعت و پہنائی سے کائنات کا کوئی ذرہ باہر نہ ہو' اقوام و امم کا عروج و اقبال' تنزل و ادبار' اس سے کیوں رہ جائے۔ وہ کہتا ہے وہ قانون کام کر رہا ہے۔ قوموں اور جماعتوں کے گزشتہ اعمال ہی ہیں جن سے ان کا حال بنتا ہے۔ اور حال کے اعمال ہی ہیں جو ان کا مستقبل بناتے ہیں۔ پھر اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے فرمایا۔ خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا۔ جب تک کہ وہ خود اپنی حالت نہ بدل ڈالے۔ یعنی اس بارے میں خود انسان کا عمل ہے۔ وہ جیسی حالت چاہے' اپنے عمل و صلاحیت عمل سے حاصل کر لے۔ اگر ایک قوم بدحالی ہے اور وہ اپنے

اندر ایک ایسی تبدیلی پیدا کر لیتی ہے جس سے خوش حالی پیدا ہو سکتی ہے تو خدا کا قانون یہ ہے کہ یہ تبدیلی فوراً اس کی حالت بدل دے گی۔ اور بدحالی کی جگہ خوش حالی آجائے گی۔ اس طرح خوش حالی کی بجائے بدحالی کا تغیر بھی سمجھ لو۔ فرمایا جب تک قوم نے اپنی عملی صلاحیت کھو دی اور اس طرح تبدل حالت کی مستحق ہو گئی تو ضروری ہے کہ اسے برائی پہنچے۔ یہ برائی کبھی ٹل نہیں سکتی کیونکہ یہ خود خدا کی جانب سے ہوتی ہے۔ یعنی اس کے ٹھہرائے ہوئے قانون کا نفاذ ہوتا ہے۔ اور خدا کے قانون کا نفاذ اور ہے جو روک سکے اور کون ہے جو اس کی زد سے بچا سکے۔ اس کو قرآن "استبدالِ اقوام" سے تعبیر کرتا ہے۔ اور جا بجا مسلمانوں کو متنبہ کرتا ہے کہ اگر تم نے صلاحیتِ عمل کھو دی تو وہ تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو اقبال و اقتدار کی نعمتِ عظمیٰ سے نوازیں گے اور کوئی نہیں جو اس کو ایسا کرنے سے روک سکے اور پھر وہ دوسری قوم تمہاری طرح صلاحیت و اصلاح سے محروم نہ ہو گی۔ بلکہ نیکوں کے ساتھ نرم اور بدوں کے ساتھ سخت ہوں گے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم یوں ہی قوموں کے دن بدلتے رہتے ہیں۔ اور ایک کے ہاتھوں دوسرے کو صفحہ ہستی سے مٹا دیتے ہیں۔ کیونکہ اگر ہم ایسا نہ کرتے اور ایک قوم کے دستِ تظلم سے دوسری مظلوم قوم کو نجات نہ دلاتے۔ اگر ہم ضعیف کو نصرت نہ بخشتے تاکہ وہ قوی کے طغیان و فساد سے محفوظ ہو جائے تو دنیا کا چین اور سکھ ہمیشہ کے لئے غارت ہو جاتا۔ اور قوموں کی راحت ہمیشہ کے لئے ان سے روٹھ جاتی اور اللہ کی زمین پر وہ تمام منارے گرائے جاتے جو اس کے گھر کی عظمت پر دلالت کرتے ہیں۔ وہ تمام مقدس عمارتیں خاک کا ڈھیر ہو جاتیں، جن کے اندر اس کی پرستش اور اس کے ذکر کی پاک صدائیں بلند

ہوتی ہیں۔ یہ حسین وجمیل دنیا، ایک ایسی ماورئی تصور ہلاکت وبربادی کا منظر ہو جاتی
جس کی سطح پر خوں ریز انسانوں کی بوسیدہ ہڈیوں اور منہدم عمارتوں کی اڑتی ہوئی خاک
کے سوا اور کچھ نہ ہوتا۔ یہ انقلاب جو قوموں اور ملکوں میں ہوتے رہتے ہیں، یہ جو پرانی
قومیں مرتی اور نئی قومیں ان کی جگہ لے لیتی ہیں۔ یہ جو قومیں کمزور ہو جاتی ہیں اور
کمزوروں وضعیفوں کو باوجود ضعف کے غلبہ کے سامان میسر آجاتے ہیں، یہ تمام
حوادث، اسی حکمت اور قانون الٰہی کا نتیجہ ہیں۔ جو تمام کائناتِ ہستی میں کارفرما
ہے۔ اور جس کا نام بقاء اصلح یا البقاء انفع کا قانون فطرت ہے۔ یہ سب کچھ اس کی
کرشمہ سازیاں ہیں۔ اس لیے جو قوم حق پر ہے وہی نافع ہے اور اس کے لیے
ثبات وبقا ہے، اقبال وعروج ہے اور جو قوم جادۂ حق سے منحرف ہو وہی باطل
پر ہے اور غیر نافع ہے اور اس کے لیے مٹنا ہے، فنا ہے اور زوال ونیستی ہے۔

پھر دیکھو قرآن کریم نے اس نازک اور دقیق حقیقت کے لیے کیسی صاف
اور عام فہم مثال بیان کردی جس کے معائنہ سے کوئی انسانی آنکھ بھی محروم نہیں
ہو سکتی۔ فرمایا جب پانی برستا ہے اور زمین کے لیے شادابی وگل ریزی کا سامان مہیا
ہونے لگتا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ تمام وادیاں نہروں کی طرح رواں ہو جاتی ہیں۔ لیکن
پھر کیا تمام پانی رک جاتا ہے۔ کیا میل کچیل اور کوڑا کرکٹ اپنی اپنی جگہ تھمے رہتے ہیں۔
کیا زمیں کی گود ان کی حفاظت کرتی رہتی ہے۔ نئی زمیں کو اپنی نشوونما کے لیے جتنے
پانی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ جذب کرتی ہے۔ ندی نالوں میں جس قدر سمائی ہوتی
ہے، اتنا ہی وہ پانی روک لیتے ہیں۔ باقی پانی جس تیزی کے ساتھ گرا تھا۔ اسی تیزی
سے بہہ بھی جاتا ہے۔ میل کچیل، کوڑا کرکٹ، جھاگ بن بن کر سمٹتا اور ابھرتا ہے۔ پھر

پانی کی روانی اس طرح اٹھا کر لے جاتی ہے کہ تھوڑی دیر کے بعد، وادی کا ایک ایک گوشہ دیکھ جاؤ کہیں ان کا نام و نشان بھی نہیں ملے گا۔ اسی طرح جب سونا چاندی یا اور کسی طرح کی دھات آگ پر تپاتے ہو تو کھوٹ الگ ہو جاتا ہے۔ خالص دھات الگ نکل آتی ہے۔ کھوٹ کے لئے نابود ہو جانا ہے اور خالص دھات کے لئے باقی رہنا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے اس لئے کہ یہاں بقاء و الانفع کا قانون کام کر رہا ہے، یہاں باقی رہنا اس کے لئے ہے جو نافع ہو۔ جو نافع نہیں وہ چھانٹ دیا جائے گا۔ یہی حقیقت حق اور باطل کی ہے۔ حق وہ بات ہے جس میں نفع ہے۔ پس وہ کبھی مٹنے والی نہیں ٹکنا، ثابت ہونا، باقی رہنا، اس کا خاصہ ہے۔ اور حق کے معنی ہی قیام و ثبات کے ہیں۔ لیکن باطل وہ ہے جو نافع نہیں۔ اس لئے اس کا قدرتی خاصہ یہ ہوا کہ مٹ جائے، محو ہو جائے۔ ٹل جائے۔

اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَھُوْقًا ط

اس حقیقت کا ایک گوشہ ہے جسے ہم نے بقاء اصلح کی شکل میں دیکھا ہے۔ اور قرآن نے اس کو اصلح بھی کہا ہے اور انفع بھی۔ کیونکہ صالح وہی جو نافع ہو۔ کارخانہ ہستی کی فطرت میں بناوٹ اور تکمیل ہے اور تکمیل جب ہی ہو سکتی ہے جب کہ صرف نافع اشیائیں باقی رکھے جائیں۔ غیر نافع چھانٹ دیئے جائیں۔ قرآن نے نافع کو حق سے اور غیر نافع کو باطل سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس تعبیر سے ہی اس نے حقیقت کی نوعیت، واضح کر دی۔ کیونکہ حق اسی چیز کو کہتے ہیں، جو ثابت اور قائم رہے۔ اور اس کے لئے مٹ جانا زوال پذیر ہونا اور فنا و نابود ہونا ممکن

نہ ہو۔ اور باطل کے معنی ہی یہ ہیں کہ مٹ جانا اور محو ہو جانا پس وہ جب کسی بات
کے لئے کہتا ہے کہ یہ حق ہے تو یہ صرف دعوی ہی نہیں بلکہ دعوے کے ساتھ اس
کی جانچ کا معیار بھی پیش کیا جاتا ہے کہ یہ بات حق ہے کہ نہ مٹنے والی اور نہ ٹلنے
والی بات ہے۔ اس عدم و زوال پذیری کے لئے اس کا باطل ہونا ہی کافی ہے مزید
دلیل کی حاجت نہیں۔ یہ دونوں اصطلاحیں قرآن کے مہمات معارف میں سے
ہیں۔ لیکن افسوس کہ علماء نے غور نہیں کیا۔ ورنہ بعض اہم مقامات میں دور
از کار تاویلوں کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اور اگر یہ ایک حقیقت سمجھ لی جائے تو
ہماری پستی اور ادبار کے لئے ان وہمی اسباب تنزل و ادبار کی ضرورت ہی نہ تھی۔

لیکن افسوس کہ قوم کے رہنماؤں نے غور و فکر سے کام نہ لیا، تو کسی
نے باعث ادبار کسی وہمی بات کو بنا لیا۔ اور کسی نے تقلید یورپ کو اور کسی
نے تملق و خوشامد غلامانہ کو۔

تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ لیکن اتنی بات سمجھ لینی ضروری ہے کہ قرآن نے
ہمارے ظہور کی علت غائی جو فرمائی ہے وہی ہمارے عروج کی بھی علت قرار دی
ہے یعنی

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ط میں ہمارے ظہور کا مقصد
نفع خلائق قرار دیا ہے۔ یوں ہی۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا
بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ط میں ہمارے عروج کی علت غائی بھی یہی
قرار دی ہے کہ اقامۃ الصلوٰۃ۔ نظام زکوٰۃ۔ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر تین

باتیں نفع رسانی خلائق کے لئے ہیں، تو گویا ہمارا ظہور و عروج دونوں نفع رسانی ناس کے لئے تھے۔ یعنی اللہ کی سلطنت قائم کرنا اور عدل الٰہی کو دنیا میں غلبہ دینا بس اس سے بڑھ کر کوئی نفع نہیں اور یہی معنی ہیں، صفات الٰہیہ کے مظہر ہونے کے۔ کیونکہ مظہریت بغیر تین باتوں کے ہو نہیں سکتی۔ پہلی بات وحدتِ مرکزیہ کا قیام۔ جس کے لئے اقامۃ الصلوٰۃ کا حکم ہے۔ اور دوسری بات ہے اشتراک مال کی اسلامی صورت، جس کی طرف نظام زکوٰۃ کے ذریعہ رہ نمائی کی گئی ہے اور تیسری بات ہے عدل الٰہی کا قیام۔ سو وہی چیز امر بالمعروف۔ و نہی عن المنکر ہے اور یہی مقصد اعلیٰ امورِ عظام میں سے ہے۔

ہم نے جب تک اپنے ظہور و عروج کے مقاصد کو سنبھالے رکھا، تو دنیا کے لئے نافع رہے۔ اس لئے ہمیں تمکین فی الارض حاصل رہا اور جب سے ہم نے اپنے ظہور و عروج کا مقصد بھلا دیا۔ تو پھر ہمیں اس منصب سے بھی محروم ہونا پڑا۔ اور قومی زندگی کی بجائے قومی موت کا سامنا ہوا۔ تو خدارا بتلاؤ کہ ہم بدبختوں اور سیاہ کاروں کا کیا حق ہے کہ قومی زندگی اور اجتماعی ترقی کا دعویٰ کریں۔ آج نہ ایمان کی دولت ساتھ ہے اور نہ طاعات و حسنات کی پونجی دامن میں، زندگی یکسر برباد غفلت و معصیت اور عمریں یک قلم تاراجِ نفس پرستی و نافرمانی اغراض نفسیاتی کی پرستش و نفاق اور نافرمانی و انکار۔

پھر نہ ندامت و ملامت اور نہ ہی توبہ و انابت، پھر خدارا بتلاؤ کس منہ سے ہم اپنی زندگی و بقا کے مدعی بن سکتے ہیں۔ فَوَاحَسْرَتَاهُ وَامُصِيبَتَاهُ ط

اصل یہ ہے کہ نظام عالم کے قوانین کی اساس و بنیاد صرف قیام عدل کی

ناقدانہ قوت پر ہے۔ خداوند تعالیٰ دنیا میں انبیاء علیہم السلام کو بھی اسلئے بھیجتا رہا ہے کہ دنیا میں اللہ کے عدل کو قائم کریں۔ لیکن چونکہ اس کے لئے اکثر اوقات تھوڑے غلبہ کی قوت قاہرہ بھی درکار ہوا اور استیلاء و استحلال کی نعمت عظمیٰ سے نوازا تاکہ دنیا سے ظلم و برائی کا خاتمہ ہو جائے۔ اور عدل الٰہی کا دور دورہ ہو اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا فرض منصبی بھی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قرار دے کر، ان کو قیام عدل کے لئے منتخب فرمایا اور میزان عدل، قسطاس المستقیم اور صراط المستقیم کا قانون اجتماعی دے کر، دنیا والوں کے لئے ان کو شہداء یعنی حق کی گواہی دینے والا بنایا پس مسلمانوں کے ظہور کی اصلی علت غائی صرف یہ ہے کہ شہادت علی الناس کا فریضہ باحسن وجوہ پورا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تمکین فی الارض والی آیۃ کے سوا جہاں کہیں بھی ان کے ظہور کی علت غائی بیان فرمائی تھی کسی جگہ بھی اقامۃ الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ کا ذکر نہیں کیا۔ بلکہ صرف شہادت علی الناس و امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر زور دیا۔ فرمایا۔

کَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ
وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط

یعنی اس طرح ہم نے تم کو امت درمیانی بنایا تاکہ اور لوگوں کے مقابلہ میں تم گواہ ہو اور تمہارے مقابلہ میں تمہارا رسول گواہ ہو۔ اور فرمایا۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ
عَنِ الْمُنْكَرِ ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ط یعنی تم میں ایک جماعت ہونی چاہیئے جو دنیا کو نیکی کی دعوت دے بھلائی کا حکم کرے اور برائی سے روکے۔ وہی فلاح

یافتہ ہیں۔ اور فرمایا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط

یعنی تمام امتوں میں سب سے بہتر امت ہو کہ اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو۔ اور برے کاموں سے روکتے ہو۔

ان تین آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا اصلی مشن، مقصد تخلیق اور نوعی امتیاز و شرف خصوصی، اس چیز کو قرار دیا ہے۔ کہ دنیا میں اعلانِ حق ان کا سرمایۂ زندگی ہے۔ اور وہ دنیا میں اس لئے کھڑے کئے گئے ہیں کہ خیر کی طرف داعی ہوں اور نیکی کا حکم دیں اور برائی کو جہاں کہیں دیکھیں اس کو روکیں عمران و تمدن کے تمام اصولوں اور قوانین کا متن، قرآن کا یہی اصل الاصول ہے اس اصول کی ہمہ گیری ہے۔ کہ امم قدیمہ کے حالات ہم پڑھتے ہیں۔ تو ہر قوم کا ایک دورِ عروج ہمارے سامنے آتا ہے۔ اور دوسرا زمانہ انحطاط، ان دونوں میں مابہ الامتیاز اور فاصل اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو یہی قیام عدل اور نفاذ جور و جفا ہے۔

جب تک قومیں قیام عدل میں ساعی و جد و جہد کرنے والی ہوتی ہیں، تو فتح و کامرانی، نصرت الٰہی و کامیابی ان کے قدم چومتی ہے۔ لیکن جب قیام عدل کی بجائے افتار ظلم، ترویج جور و ستم ان کا شعار بن جاتا ہے تو پھر قانون فطرت حرکت میں آتا ہے اور بیک جنبش ان کو صفحہ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتا ہے۔ اور پھر ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔

دور جانے کی ضرورت نہیں، خود اپنی تاریخ کو اٹھا کر دیکھو۔ جب تک ہم دنیا میں حق اور انصاف کے حامی و مددگار رہے تو خدائے تعالیٰ بھی ہمارا مددگار رہا اور دنیا کی کوئی طاقت بھی ہمارے سامنے نہ ٹھہر سکی۔ لیکن جوں ہی تاریخ اسلام کا عہد تاریک شروع ہوا اور علم و مذہب، اعلان حق اور دفع باطل کے لئے نہ رہا بلکہ حصول عز و جاہ اور حکومت و تسلط کے لئے آلۂ کار بن گیا۔ اور اس طرح علم و مذہب، حصول قوت حکمرانی اور دولت جاہِ دنیوی کا ذریعہ بن گیا۔ اجتماعی فسادات اور امراض کے چشمے پھوٹ پڑے۔ حکام عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اور علماء اور فقہاء ان کے درباروں کی زینت بن گئے۔ تو قوتِ حاکمہ کائنات کے دستِ قدرت نے بھی استبدالِ اقوام، انتخابِ ملل کے فطری قانون کو حرکت دی اور عمل بالمجازات کے دستور اٹل کو عمل میں لاتی تو پھر ہمارے ادبار اور شقاوت کو نہ ہماری حکومت روک سکی اور نہ ہی عسکری قوت۔ رسوائی و ذلت کے اس بحرِ متلاطم کے تھپیڑوں سے نہ علماء و مشائخ بچ سکے اور نہ عمال اور زاہد

آج بجز سوائے عالم مسلمان قوم کے شاید ہی کوئی قوم اس درجہ مغضوب و مقہور ہوئی ہو و ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ کا مصداق۔ بنی اسرائیل کے بعد ہم ہی تو ہیں۔

وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ط

یہ گردشِ ایام، قوموں اور ملتوں، جماعتوں اور لوگوں کے درمیان ہمیشہ جاری و ساری رہا کرتی ہے۔ اس کی گرفت سے دنیا کا کوئی شاہ نہیں بچ سکتا۔ یہ اٹل اور لازوال حقیقت ہے۔

عزم و استقامت

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ط

ہمت نہ ہارو اور نہ اس شکست کی خبر سنکر غمگین و دل شکستہ ہو۔ یقین کرو کہ اگر تم سچے مومن ہو تو آخر کار تمہارا ہی بول بالا ہے۔ اگر تم کو اس لڑائی میں سخت زخم لگے تو ہمت نہ ہارو کہ طرف ثانی کی قوت بھی اسی طرح مجروح ہو چکی ہے اور یہ وقت کے نتائج و حوادث ہیں۔ جو نوبت بہ نوبت لوگوں کو پیش آتے رہتے ہیں۔

اس امید آبادِ عالم میں ہر لمحہ اور ہر آن کتنی امیدیں ہیں جو پیدا ہوتی ہیں اور کتنے ولولے ہیں جو اٹھتے ہیں۔ پھر ان میں کتنے ہیں جن کے نصیب میں فیروز مندی

وکامرانی ہے اور کتنے ہیں جن کے لئے حسرت و یاس کے سوا کچھ نہیں۔ بے کس انسان جو آرزوؤں کا بندلوں اور حسرتوں کے خمیر کا پتلا ہے، شاید صرف اس لئے بنایا گیا ہے کہ نصف عمر امیدوں کے پالنے میں صرف کر دے اور بقیہ نامرادی کے ماتم میں کاٹ دے،

یحییٰ برمکی" نے صحرا میں ایک اعرابی کو دیکھا کہ میدان سے پتھروں کے ٹکڑوں کو جمع کرتا ہے اور جب ایک ڈھیر جمع ہو جاتا ہے تو پھر ایک ایک ٹکڑے کو اٹھاتا ہے اور جہاں سے لایا تھا اسی طرف پھینکنے لگتا ہے کیا انسانی ہستی کی پوری تاریخ اس مثال میں پوشیدہ نہ تھی۔

ہماری زندگیاں، جن کے ہنگامۂ حیات سے کارگاہ عالم میں، شورش کے طوفان اٹھتے رہتے ہیں۔ غور کیجئے تو ایک تارِ عنکبوت اور عسرت کے ایک جلتے ہوئے تنکے سے زیادہ ہستی رکھتی ہے۔

ساری عمر دو ہی کاموں میں صرف کر دیتے ہیں۔ یا صحرائے دجلہ کے اعرابی کی طرح صبح تمنائیں امیدوں کے سنگریزے جمع کرتے ہیں، یا شام نامرادی میں جہاں سے لائے تھے وہیں پھینک دیتے ہیں کہ ہمیشہ کے لیے مدفون ہو جائیں۔

مثل ہے یہ مری کوشش کی جیسے مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

کارسازِ قدرت کی بھی کیا کرشمہ سازیاں ہیں۔ کچھ خاک امید کی مٹی۔ اور کچھ خاکستر حسرت کی۔ دونوں کی آمیزش سے ایک پتلا بنایا اور انسان نام

رکھ کر اس ہنگامہ رازِ ارضی میں بھیج دیا۔ کبھی امید کی روشن سے ایک ہوتا ہے کبھی نا امیدی کی تاریکی سے گھبرا جاتا ہے۔ کبھی دلولوں کی بہار میں زمزمہ سازِ نغمہ انبساط ہوتا ہے اور کبھی حسرت و افسوس کی خزاں میں امیدوں کے پژمردہ پتوں کو گنتا ہے۔ کبھی ہنستا ہے اور کبھی روتا ہے۔ کبھی رقص نشاط ہے اور کبھی سینہ ماتم، ایک ہاتھ سے جمع کرتا ہے اور دوسرے سے کھوتا ہے۔

سراپا رہنِ عشق و ناگزیر الفتِ ہستی — عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

پس اے ساکنانِ غفلت آبادِ ہستی! وائے رہروانِ سفرِ مدہوشی و فراموشی! مجھے بتلاؤ کہ تمہاری ہستی کی حقیقت اگر یہ نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے؟ اور اے نیرنگ آرائے تماشہ گاہِ عالم، کیا یہ ہنگامہ حیات، یہ شورشِ زندگی، یہ حسرت خیز کشاکش ہستی، تو نے صرف اتنے ہی کے لئے بنائی ہے۔

کمند کوتہ و بازوئے سست و بام بلند
بمن حوالہ و نومیدیم گنہ گیرند

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ط

نہیں معلوم آغازِ عالم سے آج تک یہ سوال کتنے دلوں کے اضطراب و التہاب کا باعث ہوگا۔ مگر سچ یہ ہے کہ اپنے کان ہی بہرے ہیں۔ ورنہ کائناتِ عالم ہی کا ذرہ ذرہ اس سوال کا جواب نفی میں دے رہا ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

وَكَأَيِّن مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ ط یہ سچ ہے کہ مصائب اور ناکامی کا ہجوم انسان کے دل میں، ایسے خیالات پیدا کر دیتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس صنعت گاہ عالم کا یہ ساز و سامان، صرف اتنے ہی کے لئے نہیں ہو سکتا۔ وہ عالم انسانیت کبریٰ جو تاج خلافت الٰہی سر پر اور علامت کرامت لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ ط اپنے دوش عظمت پر رکھتا ہے کیونکر ممکن ہے کہ صرف امیدوں کے پالنے اور پھر ان کی موت و اقتضار کا تماشہ دیکھنے کے لئے بنایا گیا ہو۔

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ ط
الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَ
يَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ط رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ
هٰذَا بَاطِلًا ط سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ط

جو ارباب فکر و حکمت اللہ تعالیٰ کا ہر حال میں ذکر کرتے ہیں، اور آسمان و زمین کے ملکوت، و آثار قدرت پر تفکر و تدبر کی نظر ڈالتے ہیں، ان کی زبان سے تو یہ عالم صنعت دیکھ کر، بے اختیار صدا نکل جاتی ہے کہ خدایا یہ تمام کارگاہ صنعت تو نے بے کار و عبث نہیں پیدا کی ہے۔

بہار و خزاں اور امید و بیم۔

اس میں تو شک نہیں کہ جس قدر کاوش سے غور کیجیے گا، جذبات انسانی کی تحلیل و تفریق کے آخری عناصر، یہی دو چیزیں امید و حسرت، نظر آئے گی۔ وہ جو کچھ کرتا ہے یا آیندہ کی امید ہے اور یا رفتہ پر حسرت۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ امید

ویاس کی تقسیم کو صرف افراد و اشخاص میں محدود نہ کیجیے بلکہ اس میں دراصل قوموں اور ملکوں کی تاریخ پوشیدہ ہے، باغ و چمن میں بہار و خزاں، دو موسم ہیں، جو یکے بعد دیگرے آتے ہیں اور اپنی اپنی آمد کے متضاد و مخالف آثار چھوڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح امید اور حسرت کو دو مختلف موسم تصور کیجیے جو قوموں اور ملکوں پر بھی آتے ہیں۔ اور وہ نامرادی و کامرانی کی تقسیم ہے جو اپنے اپنے وقتوں پر قوموں میں ہو جاتی ہے۔ بعض قومیں ہیں، جن کے حصہ میں امید کی بہار آئی ہے اور بعض ہیں، جو اب صرف یاس اور حسرت کی خزاں ہی کے لیے رہ گئے ہیں۔

موسم بہار زندگی و شگفتگی کا موسم ہوتا ہے اور انسان کے اندر سے رگوں میں دوڑنے والے خون سے لے کر درختوں کی شاخوں اور ٹہنیوں تک ہر چیز میں جوشِ حیات اور ولولہ انبساط پیدا ہو جاتا ہے یہی حال ان قوموں کا ہوتا ہے جو اپنے دور امید سے گزرتی ہیں۔ تمام دنیا ان کے لئے ایک بہشت امید بن جاتی ہے اور اس کی ہر آواز ان کے کانوں کے لئے ایک ترانۂ امید کا کام دیتی ہے۔ اپنے اندر دیکھتے ہیں تو دل کا ہر گوشہ امیدوں اور ولولوں کا آشیانہ نظر آتا ہے اور باہر نظر ڈالتے ہیں تو دنیا کا کوئی حصہ عروس امید کی مسکراہٹ سے خالی نہیں ہوتا۔ اس طلسم زار ہست و نیست میں، انسان سے باہر نہ غم کا وجود ہے اور نہ خوشی کا۔ زندگی کی تمام کامیابیاں اور مسرتیں دراصل دل کی عشرت کامیوں سے ہیں۔ جب تک آپ کے دل کے طاقِ تجلی میں، امید کا چراغ روشن ہے۔ اس وقت تک دنیا بھی عیش و مسرت کی روشنی سے خالی نہیں لیکن اگر باد صرصر نامرادی کا کوئی جھونکا وہاں تک پہنچ گیا تو پھر خواہ آفتاب نصف النہار پر درخشاں

کیوں نہ ہو مگر یقین کیجئے کہ دنیا کا یہ تمام نظام منور، آپ کے لئے ظلمت سرائے تاریک ہے۔

یہ وہ خوش نصیب قومیں ہیں کہ ان کے دل کے اندر امید کا چراغ روشن ہوتا ہے۔ یہ جہاں جاتے ہیں اقبال و کامرانی کی روشنی استقبال کرتی ہے۔ چونکہ ان کے دل کے اندر سلطان امید فتحیاب ہوتا ہے، اس لئے زمین کے اوپر بھی نامرادی و ناکامی کی صفوں پر فتحیاب ہوتے ہیں۔ جس ہاتھ میں امید کا علم ہو، پھر دنیا کی کوئی قوت اس ہاتھ کو زیر نہیں کر سکتی۔ ان کی امید، حسرت و آرزو نہیں ہوتی۔ جو محض ناکامی و نامرادی کے ماتم کے لئے ہے، بلکہ کامیابیوں کا ایک پیغام دعوت ہے، جو دل میں امید بن کر اور دل کے باہر عیش و مراد کی کامرانی و فیروزمندی کی صورت بن کر، جلوہ آرا ہوتی ہے۔ لیکن اس سطح ارضی کے اوپر، جو امید کی کام بخشیوں سے، خوش نصیب قوموں کے لئے، عیش مراد کا ایک چمن زار نشاط ہے، وہ بدنصیب قومیں بستی ہیں جن کے دامن حیات میں، امید و یاس کی بخشش کے وقت، امید کے پھولوں کی جگہ، صرف ناامیدی کے کانٹے ہی آئے ہیں۔ جو خزاں کے افسردہ کن موسم کی طرح دنیا میں صرف اس لئے زندہ رہتے ہیں کہ بہار گزشتہ پر ماتم کریں اور خزاں کے جھونکوں سے اپنے درخت امید کی پت جھڑ دیکھ دیکھ کر آنسو بہائیں، وہ دنیا جو اوروں کے لئے اپنی ہر صدا میں پیغام امید رکھتی ہو ان کے لئے یکسر ماتم کدۂ یاس بن جاتی ہے۔ دل جب مایوس ہو تو دنیا کی ہر چیز میں مایوسی ہے۔ ان کے دلوں میں امید کا چراغ بجھ جاتا ہے، تو دل کے باہر بھی کہیں روشنی نظر نہیں آتی۔ دنیا کے وسیع صحرا جن پر قدرت نے

طرح طرح کی نباتاتی نعمتوں کا دسترخوان چن دیا ہے۔ وہ خوش نما اور عظیم الشان آبادیاں جن کو انسانی اجتماع اور مدنی نعمتوں نے زمین کے عیش و نشاط کا بہشت بنا دیا ہے۔ وہ عظیم الشان اور بے کنار سمندر جن پر حکمرانی کی طاقت حاصل کرنے کے بعد پھر خشکی کے ٹکڑوں پر حکمرانی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

غرضیکہ اس زمین اور زمین پر نظر آنے والی تمام چیزیں ان سے اس طرح منہ پھیر لیتی ہیں گویا وہ اس زمین کے فرزند ہی نہیں ہیں، بلکہ بڑی بڑی آبادیاں قوموں اور جماعتوں کی فاتحانہ امنگوں کی جولانگاہ ہوتی ہیں تو ان بدنصیبوں کے لئے، صحراؤں کے بھٹ اور پہاڑوں کے غاروں میں بھی کوئی گوشہ عافیت نہیں ہوتا۔

صحراؤں کی فضائیت، ہوا کی سنسناہٹ اور دریاؤں کی صدائے روانی اوروں کے لئے پیام امید ہوتی ہے۔ مگر ان کے کانوں میں سب سے نامرادی و فغاں کی صدائیں اٹھ اٹھ کر طعنہ زن ہوتی رہتی ہیں۔ دنیا میں اگر بہار و خزاں امید و یاس۔ شادی و غم نغمہ و نوحہ خندہ و گریہ اور فنا و بقا دو ہی چیزیں ہیں جن کی زمین کے بسنے والوں کو بخشش ہوئی ہے۔ تو مختصر یوں سمجھ لیجئے کہ پہلی قوموں کو بہار و امید اور شادی و نشاط کا حصہ ملا ہے اور دوسروں کو یک سر یاس و حزن، نوحہ و ماتم اور گریہ و فغاں کا

ما خانہ رمیدگان ظلیم
پیغام خوش از دیار ما نیست

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ط

لیکن یہ حالات و نتائج کا ایک دور ہے۔ جو نوبت بہ نوبت دنیا کی تمام قوموں بلکہ کائنات کی ہر شئے پر طاری ہوتا ہے، قرآن کریم نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ط

امید و یاس، شادی و غم اور فتح و شکست کے یہ ایام ہیں جو نوبت بہ نوبت انسانوں پہ گزرتے ہیں۔

دنیا میں کوئی شئے نہیں جس نے غم سے پہلے اپنی شادی کے دن بھی نہ دیکھے ہوں اور باغ میں کون سا زندہ درخت ہے جس نے خزاں کے جھونکوں کے ساتھ نسیم بہار کی لذتیں بھی نہیں لوٹی ہیں۔ دنیا عالم اسباب ہے اور یہاں کا ایک ذرہ بھی قوانین فطریہ و سلسلۂ علل و اسباب کی ماتحتی سے باہر نہیں۔ پس یہ انقلاب کی حالت بھی ایک قانون الٰہی اور ناموس فطری کے تحت ہے۔ جس نے ہمیشہ اس عالم میں یکساں نتائج پیدا کئے ہیں اور ان میں تبدیلی ممکن نہیں۔

وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ط

اللہ کے بنائے ہوئے قانون میں تم کبھی تبدیلی نہ دیکھو گے۔

باغ و چمن میں، بہار و خزاں کا انقلاب ہو۔ دریاؤں میں جزر و مد کا اتار چڑھاؤ ہو۔ سمندروں میں سکون و ہیجان کا تغیر ہو۔ افراد حیوانی کی حیات و ممات اور شباب و کہولت کا ایاب و ذہاب۔ افراد کی صحت و علالت اور اقوام کا عروج و زوال، یہ تمام حالتیں فی الحقیقت انہی قوانین فطریہ کے ماتحت ہیں۔ جن کو فاطر السموات والارض نے اس عالم کے نظام و قوام کے لئے

روز ازل سے مقرر کر دیا ہے۔ پھر جن افراد و اقوام نے ان قوانین کے مطابق راہ امید اختیار کی ہے۔ ان کے لئے امید کی زندگی ہے اور جنہوں نے اس سے روگردانی کی ہے ان کے لئے نامرادی و ناکامی کی مایوسی ہے، قانون جرم کی سزا دیتا ہے۔ پر مجرم کو جرم کرنے کے لئے مجبور نہیں کرتا پس شکایت کارساز قدرت کی نہیں۔ بلکہ خود اپنی ہونی چاہیے۔ خدا نے امید کا دروازہ کسی پر بند نہیں کیا ہے اور زمین کی راحت کسی ایک قوم کے ورثہ میں نہیں دے دی ہے۔ اس نے پھول اور کانٹے دونوں پیدا کئے ہیں۔ اگر ایک بدبخت کانٹوں پر لپٹا ہے۔ مگر پھولوں کو دامن میں نہیں چنتا تو اسے اپنی محرومی پر رونا چاہیئے۔ باغبان کا کیا قصور ہے۔

فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ

خدا کے انصاف سے بعید تھا کہ وہ کسی پر ظلم کرے۔ مگر افسوس کہ بد اعمالیاں کر کے خود آپ انہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ

یہ سب بربادیاں تم نے خود اپنے ہاتھوں مول لیں ورنہ اللہ تو اپنے بندوں کے لئے کبھی بھی ظالم نہیں۔

اس نے دنیا کے آرام و راحت اور عیش و کامرانی کو انسان کے ماتحت نہیں بلکہ انسانی اعمال کا محکوم بنایا ہے اور جب تک کوئی قوم خود اپنے اعمال میں تبدیلی پیدا نہیں کر دیتی اس پر زمین کی راحتوں کا دروازہ بھی بند نہیں ہوتا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ

ان قوموں کی نامرادی وناامیدی کی یہ سزا اس لئے دی گئی کہ ایسا ہی اس کا قانون ہے۔ جو نعمت خدا نے کسی قوم کو دی ہو پھر وہ کبھی واپس نہیں لی جاتی۔ تاآنکہ خود وہ قوم اپنی صلاحیت اور قابلیت کو بدل نہ ڈالے۔

ماضی اور حال

یہ انقلاب قدرتی ہے اور نہیں معلوم اس دنیا میں کتنے دور قوموں اور ملکوں پر اس کے گذر چکے ہیں۔ آج امید وکامیابی کے جس آفتاب سے غیروں کے ایوان اقبال روشن ہو رہے ہیں۔ کبھی ہمارے سروں پر بھی چمک چکا ہے۔ اور جس بہار کے موسم عیش ونشاط سے ہمارے حریف گزر رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے باغ وچمن ہی میں اس کے جھونکے آیا کرتے تھے۔ اب کس سے کہیئے کہ کہنے کا وقت ہی چلا گیا۔

گزر چکی ہے یہ فصل بہار ہم پر بھی

ہم ہمیشہ سے ایسے نہیں ہیں۔ جیسے کہ اب نظر آرہے ہیں۔ زمانہ ہمیشہ ہم سے برگشتہ نہیں رہا۔ مدتوں امید کا ہم ہیں آشیانہ رہا ہے۔ بلکہ ہمارے سوا اس کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اب دنیا میں ہمارے لئے ماتم وناامیدی۔ دو ہی کام کرنے کے لئے باقی رہ گئے ہیں لیکن زیادہ دن نہیں گزرے کہ ہماری زندگی کے لئے اس دنیا میں اور بھی بہت سے کام تھے۔

وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ط

اور ہم نے ان قوموں کو اچھی اور بری امید اور مایوسی فتح اور شکست دونوں

حالتوں میں ڈال کر آزمایا کہ شاید یہ بداعمالیوں سے توبہ کریں اور راہِ حق اختیار کرلیں۔

فَاِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ وَّمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ط

اور بے شک اس انقلابی حالت میں عبرت و موعظت کی بہت سی نشانیاں ہیں۔ مگر ان میں اکثر لوگ ایمان و ایقان کی دولت سے محروم تھے۔

ہجوم یاس و اختلالِ نظامِ امید۔

مَنْ کَانَ یَظُنُّ اَنْ لَّنْ یَّنْصُرَہُ اللّٰہُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ فَلْیَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَی السَّمَآءِ ثُمَّ لْیَقْطَعْ فَلْیَنْظُرْ ھَلْ یُذْھِبَنَّ کَیْدُہٗ مَا یَغِیْظُ ۔ وَکَذٰلِکَ اَنْزَلْنٰہُ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ وَّاَنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یُّرِیْدُ ط

جو شخص مایوس ہو کر اللہ کی نسبت ایسا ظن بد رکھتا ہو۔ کہ اب دنیا و آخرت میں خدا اس کی مدد کرے ہی گا نہیں، تو پھر اس کو چاہیئے کہ اوپر کی طرف رسی تانے اور اس کا پھندا بنا کر اپنے گلے میں پھانسی لگالے اور اس طرح زمین سے جہاں اب وہ اپنے لئے مایوسی سمجھتا ہے۔ اپنا تعلق قطع کرلے پھر دیکھے کہ آیا اس تدبیر سے اس کی وہ شکایت جس کی وجہ سے مایوسی طاری ہوئی تھی دور ہوگئی یا نہیں۔ اسی طرح ہم نے قرآن کریم میں ہدایت و فلاح کی روشن دلیلیں اتاری ہیں کہ تم ان پر غور کرو۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے۔ اس کے ذریعے ہدایت بخشتا ہے۔

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارمان ہونگے

موجودہ جنگ بلقان یا جنگ اسلام و فرنگ کی اگر تاریخ لکھی جائے گی تو اس میں شاید سب سے زیادہ موثر اور درد انگیز باب، مسلمانانِ عالم کے اضطراب امید و بیم کا ہوگا۔ یہ سچ ہے کہ میدانِ جنگ میں صرف مجاہدین، ترک تھے۔ لیکن اگر ہزاروں ہیں جنہیں خوابِ غفلت سے مہلت نہیں۔ تو ان کی تعداد بھی کم نہیں جو اب تک بستروں پر لیٹے ہیں۔ مگر اضطراب کی کروٹیں بھی بدل رہے ہیں اور یہ یقیناً کارفرما قدرت کی ایک سب سے بڑی توفیق بخشی ہے۔ اگر موسم بدلنے کا وقت آگیا ہے تو اتنے آثار بھی کم نہیں۔ ہم نے بڑے بڑے آتشکدوں اور تنوروں کو دیکھا ہے۔ ان کے اندر سے آگ کے مہیب شعلے اٹھ رہے تھے۔ حالانکہ چند گھنٹے پیشتر ان کی تہہ میں چند چھپی ہوئی چنگاریوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ انہی خاکستر کے تودوں میں چھپی ہوئی چنگاریوں کو جب بادِ تند و تیز کے چند جھونکے میسر آگئے تو چشم زدن میں دہکتے ہوئے انگاروں اور اچھلتے ہوئے شعلوں سے تنور بھر گیا۔ پھر کیا عجب ہے کہ سوزِ تپش کی جو چنگاریاں اس وقت دلوں میں چھپی ہوئی نظر آرہی ہیں، توفیقِ الٰہی کی بادِ شعلہ افروز، انہیں سے اس آتشکدہ حیات کو گرم کر دے جو افسوس ہے کہ روز بروز خاکستر سے بھرتا جاتا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ
وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ۔

بہتر ہے کہ اس بارے میں میری زبان پر صاف صاف سوالات ہوں۔ پھر کیا وقت ہوگیا ہے کہ ہم ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جائیں۔ کیا ہم یہ سمجھیں کہ امید و یاس کی تقسیم میں اب ہمارے لئے صرف یاس رہ گئی ہے اور تکمیل تمامی

جس قدر وقت باقی رہ گیا ہے، اس میں صرف رفتہ کا ماتم اور آئندہ کی ناامیدی، دو ہی کام کرنے کے لیے باقی رہ گئے تھے کیا یہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ ہماری زندگی کی آخری ساعات اور موت کے احتضار کی آخری حرکت ہے۔

کیا چراغ میں تیل ختم ہو گیا اور بجھنے کا وقت قریب ہے؟ اور سب سے آخر یہ کہ کیا اعدائے اسلام اور اسلام کا آخری مقابلہ ہو چکا ہے اور یسوع کی مصلوب اور مردہ لاش نے خدائے حی و قیوم پر فتح پائی

میں سمجھتا ہوں کہ یہ سوالات مختلف شکلوں میں آج بہتوں کے سامنے ہوں گے۔ ممکن ہے کہ مایوسی کا غلبہ میرے اعتقاد کو مغلوب کرے۔ اور اس لئے ممکن ہے کہ میں تسلیم کر لوں کہ ہمارے مٹنے کا وقت آگیا ہے۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلم قلب، جس میں ایک ذرہ برابر بھی نورِ اسلام باقی ہے، ایک منٹ ایک لمحہ، ایک دقیقہ اور ایک عشر دقیقے کے لئے بھی اس کو مان سکتا ہے کہ اسلام کے مٹنے کا وقت آگیا ہے۔ انسانوں ہی نے ہمیشہ انسانوں کو مغلوب کیا ہے، اور نئی قوموں نے ہمیشہ پرانی قوموں کی جگہ لی ہے، اس کا حریف، اس عالم میں دیو نہیں بلکہ انسان ہی ہے، پس یہ کوئی عجیب بات نہیں اگر ہم کو ہمارے سیزدہ صد سالہ دشمن آج مغلوب کر کے فنا کر دیں، مگر اے خدا کی رحمت کی توہین کرنے والو! میں یہ کیوں کر مان لوں کہ ایک مصلوب لاش، حی و قیوم خدائے ذوالجلال کو مغلوب کر سکتی ہے اور مایوسی خواہ کتنی ہو مگر کیونکر تسلیم کر لوں کہ انسانی گروہ خدائے قادر ذوالجلال کی جبروت و کبریائی کو شکست دے سکتے ہیں۔

حیران ہوں کہ آج مسلمان مایوس ہو رہے ہیں۔ حالانکہ میں تو فکر و مایوسی

کے تصور سے کانپ جاتا ہوں۔ کیونکہ یقین کرتا ہوں کہ مایوس ہونا اس خدائے ذوالجلال والاکرام کی شانِ رحمت و ربوبیت کے لئے سب سے بڑا انسانی کفر اور اس کی جناب میں سب سے زیادہ نسلِ آدم کی شوخ چشمی ہے۔ تم جو ان بربادیوں اور شکستوں کے بعد مایوس مایوس ہو رہے ہو تو بتلاؤ کہ تم نے خدائے اسلام کی قوت و رحمت کو کس پیمانہ سے ناپا؟ وہ کون سا کاہنِ ابلیس ہے، جس نے خدا کے خزانۂ رحمت کو دیکھ کر تمہیں بتلا دیا ہے کہ اب اس میں تمہارے لئے کچھ نہیں۔

اَطَّلَعَ الْغَیْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ط اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَیْبُ فَهُمْ یَكْتُبُوْنَ ط

پھر تم کو کیا ہو گیا کہ تم مایوس ہو رہے ہو۔ اور کیوں تم نے خدا کی طرف سے منہ پھیر لیا ہے۔ تم کہتے ہو کہ اب ہمارے لئے مایوسی کے سوا کچھ نہیں۔ حالانکہ ایک مسلم دل کے لئے ناامیدی سے بڑھ کر کوئی کفر نہیں۔

لَقَدْ جِئْتُمْ شَیْئًا اِدًّا تَكَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ط

یہ تم نے ایسی بڑی سخت بات منہ سے نکالی ہے جس کی وجہ سے عجب نہیں کہ آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزے ریزے ہو کر زمین کے برابر ہو جائیں۔

امید و بیم

خدا کی رحمت سے کافروں کے سوا اور کون مایوس ہو سکتا ہے۔

انسان شاید یاس و امید کے بارے میں کچھ فطرتاً عاجل ہے۔ اس کی فطرت سادہ بچوں کی مثال سے واضح ہوتی ہے۔ بچوں کا قاعدہ ہے کہ ہر حالت کا اثر بغیر تفکر و تدبر کے دفعتہً قبول کر لیتے ہیں۔ روتے ہوئے بچے کو مٹھائی کا ایک ٹکڑا ایک ٹکڑا دیجیے! تو ہنسنے لگتا ہے اور چھین لیجیے تو فوراً اچھل جاتا ہے۔

بعینہ یہی حال عقل و فکر کے نشو و نما کے بعد بھی انسان کا ہوتا ہے البتہ تاثر و نتائج کی صورت بدل جاتی ہے، قرآن کریم نے اسی فطرتِ انسانی کی عجلت پسندی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جب کہ کہا ہے کہ خُلِقَ الْإِنسَانُ مِنْ عَجَلٍ انسان کی خلقت بازی اور تعجیل کا رہے۔ مصائب کے حس اور شادمانی کے غرور میں بھی دیکھیے تو اس کی یہی جلد بازی اور نہ داشری ہر موقع پر کام کرتی ہے۔ وہ کس قدر جلد غم گین ہو جاتا ہے اور پھر ایک روتے ہوئے بچے کی طرح جس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ٹکڑا دے دیا گیا ہو، کس قدر جلد خوش ہو جاتا ہے" اس کی مایوسی اور امیدواری دونوں کا یہی حال ہے۔ جب کبھی وہ اپنی کسی توقع میں ناکامی دیکھتا ہے تو فوراً مایوس ہو کر بیٹھ رہتا ہے۔ اور پھر جب کبھی کوئی کامیابی کی خبر سن لیتا ہے تو امید و مسرت کے ضبط سے جا بجا ہو کر اچھل پڑتا ہے، حالانکہ نہ تو اس کو ان اسباب کی خبر ہے جو بشارت امید کے بعد پیش آنے والے ہیں، اس کی خدا پرستی بھی اس جلد بازانہ یاس و بیم سے شکست کھا جاتی ہے۔ اگر کوئی خوشی حاصل ہوتی ہے تو سمجھتا ہے کہ خدا میرے ساتھ ہے۔ اور اگر نتائج حالات اور مشیت الٰہی کسی ابتلا و مصیبت میں ڈال دیتی ہے تو دیوانہ وار مایوس ہو جاتا ہے کہ خدا نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ سورۃ الفجر میں اسی حالت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور تمہارے اللہ وہ کون سی شے ہے جس کی طرف قرآن

نے اشارہ نہیں کیا۔

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۝

انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا پروردگار اس کے ایمان کو اس طرح آزماتا ہے کہ اس کو دنیا میں عزت اور نعمت عطا فرماتا ہے تو فوراً خوش ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میرا پروردگار اعزاز و اکرام کرتا ہے اور جب اس کے ایمان کو کسی آزمائش میں ڈال کر اس طرح آزماتا ہے کہ اس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے یعنی مصیبت میں ڈال دیتا ہے تو پھر مشاً مایوس ہو کر کہنے لگتا ہے کہ میرا پروردگار تو مجھے ذلیل کر رہا ہے۔ اور میرا کچھ خیال نہیں کرتا۔

حیات امید و موت قنوط

منجملہ ان حالات کے سب سے زیادہ خطرناک گمراہی انسان کی وہ مایوسی ہے جو مصائب و آلام کا ہجوم دیکھ کر اپنے دل میں پیدا کر لیتا ہے۔ اور اس طرح خود اپنے ہاتھوں اپنے مستقبل کے لئے نامرادی و ناکامی کی بنیاد رکھ دیتا ہے۔

مایوسی سے بڑھ کر کوئی شے انسانیت کے لیے قاتل و مہلک نہیں اور دنیا کی تمام کامرانیاں صرف امید کے قیام پر موقوف ہیں۔ یہ امید ہی ہے جس نے زمینوں پر قبضہ کیا پہاڑوں کے اندر سے راستہ پیدا کیا ہے۔ سمندر کی تھاری کو مسطح کیا ہے اور جب چاہا ہے اس میں اپنی سواری کے مرکب چلائے ہیں۔ اور جب چاہا ہے اس کے کناروں کو میلوں اور فرسخوں تک خشک کر دیا ہے۔ پھر

امید ہی ہے جس نے مردہ قلوب کو زندہ کیا ہے۔ بسترِ مرگ سے بیماروں کو اٹھایا ہے۔ ڈوبتوں کو کناروں تک پہنچایا ہے۔ بچوں کو جوانی کی تیزی سے دوڑایا ہے اور بوڑھوں کو جوانوں سے زیادہ قوی و طاقتور بنا دیا ہے۔ جب کہ قوتیں جواب دے دیتی ہیں۔ جب کہ زمانہ منہ پھیر لیتا ہے۔ جب کہ زمین کے کسی گوشہ سے صدائے ہمت نہیں آتی، اور جب کہ تمام اعضائے عمل جواب دے دیتے ہیں تو امید ہی کا فرشتہ ہوتا ہے۔ جو مسکراتا ہوا آتا ہے۔ اپنے پروں کو کھولتا ہے اور اس کے سایہ میں لے کر قوت و طاقت، ہمت و مستعدی و چستی و چالاکی کی ایک روح تازہ دلوں میں پیدا کر دیتا ہے۔

دنیا میں کامیابی اعمال کا نتیجہ ہے اور اعمال کے لئے پہلی چیز امید ہے۔ جب تک انسان کے اندر امید قائم ہے مصیبتوں اور ہلاکتوں کے عفریت بھی سامنے آکھڑے ہوں تو بھی اس کو شکست نہیں دے سکتے۔

اگر خون اور اس کا دوران انسان کی جسمانی حیات کے لئے ضروری ہے تو یقین کیجئے کہ اخلاقی و ادبی حیات کے لئے امید اس کے اندر بمنزلہ روح کے ہے۔ جب تک اس کا دوران دل سے اٹھ کر باصطلاحِ حال، دماغ سے نکل کر جسم کے تمام گوشوں میں حرارت عمل پیدا کر رہا ہے۔ اس کی قوت عمل زندہ، اس کے اعضائے کار متحرک اور پائے مستعدی سرگرم تگاپو ہیں لیکن جہاں روح دل سے نکلی، پھر جسم انسانی کے لئے قبر کے سوا کہیں بھی ٹھکانہ نہیں۔

ایک شخص جب مایوس ہو گیا۔ جب اس نے یقین کر لیا کہ اب اس کے لئے دنیا میں کچھ نہیں۔ جب اس نے فیصلہ کر لیا کہ خدا اسے کچھ نہ دے گا تو ظاہر ہے کہ اس

کا دماغ کیوں سوچے، دل میں امنگ کیوں پیدا ہو، ہاتھ کیوں ہلے۔ اور پاؤں بڑھنے کے لئے کیوں متحرک ہوں۔

قوموں کی زندگی کی ایک بہت بڑی علامت یہ ہے کہ ان کا دل، امید کا دائمی آشیانہ ہوتا ہے اور خواہ ناکامی اور مصائب کا کتنا ہی ہجوم ہو مگر امید کا طائر مقدس ان کے دل کے گوشے سے نہیں اڑتا۔ وہ دنیا کو ایک کارگاہ عمل سمجھتے ہیں اور امید کہتی ہے کہ یہاں جو کچھ ہے صرف تمہارے ہی لئے ہے۔ اگر آج تم اس پر قابض نہیں ہو تو غم نہیں کیونکہ عمل و جہد کے بعد کل کو وہ تمہارے ہی لئے ہونے والی ہے۔ مصیبتیں جس قدر آتی ہیں، وہ ان کو صبر و تحمل کی ڈھال پر روکتے ہیں۔ اور غم و اندوہ سے اپنے دماغ کو معطل نہیں ہونے دیتے بلکہ مصیبتوں کو دور کرنے اور ان کی صفوں پر غالب آنے کی تدابیر پر غور کرتے ہیں۔ نامرادی ان کے دلوں کو مجروح کرتی ہے۔ پر مایوس نہیں کرتی۔ اور غم کے لشکر سے ہزیمت اٹھاتے ہیں۔ پر بھاگتے نہیں۔

دنیا ایک میدان کارزار ہے اور جس چیز کو تم عمل کہتے ہو در اصل یہ ایک حریفانہ کش مکش اور مقابلہ ہے۔ پس جس طرح جنگ میں رہنے والے سپاہیوں کو فتح و شکست سے چارہ نہیں، وہ کبھی زخمی کرتے ہیں اور کبھی خود زخمی ہوتے ہیں۔ اسی طرح دنیا میں بھی جو مخلوق بستی ہے اُسے کامیابی اور ناکامی اور فیروزمندی و نامرادی سے چارہ نہیں۔ کیا ضرور ہے کہ ہمیشہ ہماری تلوار اور دشمن کی گردن ہو۔ کیوں نہ ہم اپنے سر و سینہ میں بھی زخم کے نشان پائیں۔ بستر پر آرام کرنے والوں کو رونا چاہیے کہ پاؤں میں کانٹا چبھ گیا۔ لیکن سپاہی کو زخموں

پھر زخم کھا کر بھی اف نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اس کی جگہ تو بستر نہیں۔ بلکہ میدان جنگ ہے۔

شکست و زخم کا خوف ہے تو میدان جنگ میں قدم ہی نہ رکھو۔ اور تلواروں سے بچنا چاہتے ہو تو تمہارے لئے بہترین جگہ پھولوں کی سیج ہے۔ چلو گے ٹھوکر کھاؤ گے اور لڑو گے تو زخم سے چارہ نہیں۔ پس اگر ٹھوکر لگی ہے تو آنکھیں کھولو۔ اور بیٹھ کر رونے کی جگہ، تیزی سے چلو، کیونکہ جتنی دیر بیٹھ کر تم نے اپنا گھٹنا سہلایا۔ اتنی دیر میں قافلہ اور دور نکل گیا۔

پھر اگر دشمن کی کاٹ نے زخمی کیا ہے تو بھاگتے کیوں ہو۔ مایوسی خودکشی ہے اور امید زندگی، اور زیادہ چابک دستی سے پیکار جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ کیونکہ جب تک دوسروں کو زخمی کرتے تھے زیادہ ہمت مطلوب نہ تھی۔ لیکن زخم کھا کر تم نے معلوم کر لیا کہ دشمن توقع سے زیادہ قوی ہے اور اب پہلے سے زیادہ ہمت اور مستعدی مطلوب ہے۔

میں نے کہا کہ قومی زندگی کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ اس کا ہر فرد ایک پیکر امید ہوتا ہے اور اپنے دل کو امید کی جگہ سمجھتا ہے نہ کہ مایوسی کی جگہ لیکن اتنا ہی نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ زندہ قوموں کے لئے مایوسی کے اسباب میں امید کا پیغام ہوتا ہے اور مصیبتیں جتنی برستی ہیں، اتنی ہی وہ اپنی امید کو زیادہ محبت اور پیار سے پالتے ہیں۔

مصیبتیں ان کو مایوس نہیں کرتیں بلکہ غفلت سے ہشیار کر دیتی ہیں اور عبرت و تنبیہ کی صورت میں ان کے سامنے آتی ہیں۔ وہ مصائب کے سیلاب کو دیکھ

کر بیٹھ گئے نہیں۔ بلکہ اس راہ کو ڈھونڈ کر بند کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں سے اس نے نکل کر بہنے کی راہ نکالی ہے۔

پس مصائب ان کے لئے امید ہو جاتے ہیں اور نامرادی ان کے لئے کامیابی کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ وہ جس قدر کھوتے ہیں۔ اتنا ہی زیادہ پاتے ہیں اور جس قدر گرتے ہیں اتنا ہی زیادہ مستعدی سے اٹھتے ہیں۔ وہی دنیا جو کل تک ان کے لئے نامرادیوں کی دوزخ تھی۔ یکایک کامیابیوں کا بہشت بن جاتی ہے۔ اور جس طرف دیکھتے ہیں تخت فتحیابی بچھے ہوئے اور انہار کامرانی بہتی نظر آتی ہیں۔ یہی بہشت امید ہے جس کے رہنے والوں کی نسبت کہا گیا ہے کہ:

مُتَّکِئِیْنَ فِیْہَا عَلَی الْاَرَآئِکِ لَا یَرَوْنَ فِیْہَا شَمْسًا وَّلَا زَمْہَرِیْرًا ط

کامیابی و فیروزمندی کے تخت پر تکئے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ غم و اندوہ کی سوزش و تپش کا انہیں حس تک نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے پس دنیا بھی ان کو مایوس نہیں کرتی۔ زندگی، امید اور موت، قنوط۔

لیکن اسی طرح قومی زندگی کے ایام ممات اور انسانی ارتقائے حیات کا سدباب اس دن سے شروع ہوتا ہے جس دن کاشانہ دل سے امید کا جنازہ اٹھتا اور مایوسی کا تشکر فنا امنڈتا ہے، جس فرد یا جس قوم کو مصیبتوں اور ناکامیوں کے عالم میں مایوس دیکھو یقین کرو کہ اس کا آخری دن آگیا۔ مصیبتیں تو اس لئے تھیں تاکہ غفلت کو شکست اور ہمت کو تقویت ہو۔ لیکن جو لوگ اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جاتے ہیں دنیا کے اعمال و تدابیر کا دروازہ اپنے اوپر بند کر لیتے ہیں اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اب ہمارے لئے دنیا میں کچھ نہیں رہا، وہ تو خود اپنے

لئے زندگی کے بدلے موت کو پسند کرتے ہیں۔ پھر دنیا کی کامیابی زندگی بنا لینے والوں کے لئے ہے۔ مٹ جانے کے متلاشیوں کے لئے نہیں ہے۔

دیکھو، قرآن کریم نے کیسے جامع الفاظ میں ایسے لوگوں کی حالت اور ان کی مایوسی کے نتائج کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس نے کس چیز کی طرف اشارہ نہیں کیا، مگر افسوس کہ بہت کم لوگ ہیں جو اس کی صداؤں پر کان لگاتے ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ

نِ اطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ نِ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ

خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ط ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ٥

اور ان لوگوں میں بعض ایسے ہیں جو خدا کی پرستش تو کرتے ہیں۔ مگر ان کے دلوں میں استقامت نہیں ہوتی۔ اگر ان کو کوئی فائدہ پہنچ گیا تو مطمئن ہو گئے اگر کبھی مصیبت آپڑی تو جدھر سے آئے تھے الٹے پاؤں ادھر ہی کو لوٹ گئے یعنی مایوس ہو کر ایمان سے ہاتھ اٹھا لیا۔ یہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے اپنی دنیا بھی کھوئی اور آخرت بھی اور یہی سب سے بڑا اور صریح نقصان ہے۔

فرمایا کہ

خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ط

کیونکہ مایوسی کے بعد انسان کی قوت عمل معطل ہو جاتی ہے۔ پھر نہ وہ صرف دنیا میں ناکام و نامراد رہتا ہے بلکہ عاقبت کی خوش حالی سے بھی اسے نا امیدی ہی ملتی ہے۔

انسان کا فرض سعی و تدبر ہے۔ اور وہ جب تک اس دنیا کی سطح پر باقی ہے

اس کو سعی و کوشش سے باز نہیں آنا چاہیئے۔ ہمارا کوئی عزیز بیمار ہوتا ہے اور اس کی حالت صحت کی طرف سے مایوس کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر بھی جواب دیدیتے ہیں۔ تاہم سعی و علاج سے آخری ساعات نزع تک باز نہیں آتے۔ جب افراد کے ساتھ ہمارا حال یہ ہے تو تعجب ہے کہ قوم و ملت کے ساتھ نہ ہو کس کو معلوم ہے کہ کب دروازۂ رحمت کھلنے والا ہے۔ اور کب بارش ہونے والی ہے دہقان کا کام یہ ہے کہ تخم پاشی کرتا رہے۔

چوں و مبدم عنایت توفیق ممکن است
در تنگنائے نزع نہ کوشد کسے چرا

ہاں اگر یہ سچ ہے تو بے شک تمہاری لافانی زندگی کو جسے قیصر روم اور کسریٰ فارس موت سے بدل نہ سکے تھے اس نے مجروح کر دیا ہے۔ تمہارے ان آہنی جسموں کو جنہیں یرموک میدان میں متمدن رومیوں کے لاکھوں تیروں کے نشانے زخمی نہ کر سکے تھے۔ یقیناً اس نے خاک و خون میں تڑپا دیا ہے۔ اور تمہارے ان نشانہائے توحید اور علمہائے دین الٰہی کو جسے آٹھ صلیبی حملوں کے لاکھوں تیر بھی نہیں گرا سکے تھے۔ سچ یہ ہے کہ سرویا کے سؤر چرانے والے نے آج پارہ پارہ کر کے گرا دیا ہے۔ پھر اس میں شک کہ تم مر گئے۔ تم جو کبھی نہیں مر سکتے تھے یقیناً مر گئے۔ تم کہ تمہاری رگوں کے اندر خدا کی روح جلال جاری ہے اور اس کی نصرت و حمایت کے ملائکہ مقربین تمہارے آگے دوڑتے تھے۔ یقیناً آج مر گئے۔ پس جس قدر تم کو ماتم کرنا ہے کر لو۔ اور جس قدر جلد اپنی قبر کھود سکتے ہو کھود لو۔ کیوں کہ خدا کی رحمت اور دنیا کی زندگی صرف امید رکھنے والوں کے لئے ہے۔ اور مایوسی کا نتیجہ موت کے

سوا اور کچھ نہیں۔ خدا تم کو نہیں چھوڑتا پر تم اسے چھوڑ رہے ہو۔ وہ تمہاری طرف دیکھتا ہے لیکن تم نے نا امید ہو کر اس کی طرف سے منھ موڑ لیا۔ تم کو معلوم نہیں کہ یہی مایوسی ہے جس کو تمہارے خدا نے کفر کی خود کشی سے تعبیر کیا ہے۔

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَاۗءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ

جو شخص مایوس ہو کر اللہ کی نسبت ایسا ظن بد رکھتا ہو کہ اب دنیا و آخرت میں خدا اس کی مدد کرے گا ہی نہیں۔ تو پھر اس کو چاہیے کہ اوپر کی طرف ایک رسی تانے اور اس کا پھندا بنا کر اپنے گلے میں پھانسی لگالے۔ اور اس طرح زمین سے جہاں اب وہ اپنے لیے صرف مایوسی سمجھتا ہے۔ اپنا تعلق قطع کرلے پھر دیکھے کہ آیا اس تدبیر سے اس کو وہ شکایت جس کی وجہ سے مایوس ہو رہا تھا دور ہو گئی؟ اس طرح ہم نے قرآن کریم میں ہدایت و فلاح کی روشن دلیلیں اتاری ہیں تاکہ تم ان پر غور کرو۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے اس کے ذریعے سے ہدایت بخشتا ہے۔

دنیا میں ہمیشہ واقعات کا مطالعہ کرنے کے لیے دو طرح کی نظریں رہی ہیں۔ ایک امید کی اور دوسری مایوسی کی۔ حکمائے یونان کی نسبت سنا ہو گا کہ آثار و نتائج عالم پر بحث کرتے ہوئے ان میں دو مختلف مذاہب امید اور مایوسی کے تھے۔ پھر جس طرح کی نظر سے تم دنیا کو دیکھو گے۔ وہ اسی رنگ میں نظر آئے گی۔ مایوسی کی نظر سے دیکھو تو اس کے دلائل بے شمار ہیں اور امید کا مذہب اختیار کرو تو اس کے پہلو مایوسی سے کم نہیں۔ اسلام ہم کو ہمیشہ امید کی تلقین کرتا ہے۔ بس کیوں نہ ہم امید

کے پہلوؤں ہی پر نظر ڈالیں گے۔

اس تیرہ سو برس کے اندر کتنی قومیں آئیں اور اپنی اپنی باری میں حفاظت اسلام کی خدمت انجام دے کر چلی گئیں۔ جب تک انہوں نے اسلام کا ساتھ دیا اور اپنے اعمال و اعتقادات میں اس سے منہ نہیں موڑا۔ اس وقت تک وہ بھی ان کے ساتھ رہا۔ لیکن جب انہوں نے اپنی صلاحیت اور قابلیت کھو دی اور مقصد کو بھول گئے جس کی انجام دہی کے لئے زمین کی وراثت ان کو دی گئی تھی تو ان کا وجود کارفرمائی ختم ہوگیا۔ اور اللہ نے اپنے دین کی حفاظت کی امانت کسی دوسری جماعت کے سپرد کردی۔ وہ اپنے کلمہ مقدس کی حفاظت کے لئے ہمارا محتاج نہیں ہے بلکہ ہم اپنی زندگی کے لئے اس کے دین مبین کی خدمت گزاری کے محتاج ہیں

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اَنۡتُمُ الۡفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الۡغَنِیُّ الۡحَمِیۡدُ ۚ

اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡهِبۡکُمۡ وَیَاۡتِ بِخَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ۚ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ بِعَزِیۡزٍ ۚ

تجدید و تاسیس

حضرت! اس وقت آپ کی توجہ ایک خاص مسئلہ کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ہے تاسیس و تجدید کا فرق۔ ہماری قومی و جماعتی ترقی کے لئے تاسیس سراسر تباہی و ہلاکت ہے۔ اور تجدید ضروری ہے۔ میں نے دو لفظ بولے ہیں۔ ایک تاسیس اور ایک تجدید۔ ان کے معانی آپ پر روشن ہیں۔

تاسیس اساس سے ہے جس کے معنی یہ ہیں یہ ہیں کہ از سر نو کسی چیز کو بنانا۔ تجدید جدت سے ہے۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی پیشتر کی بنی ہوئی چیز کو تازہ کر دینا اور اس طرح سنوار دینا۔ گویا وہ بالکل نئی ہو گئی۔ آج ہمارے قومی کاموں کی ہر شاخ میں ایک بنیادی غلطی بھی ہے کہ ہم نے اصولی طور پر طریق اصلاح کا فیصلہ نہیں کیا۔ مسلمانوں کی اصلاح حال کے لئے ضرورت، طریقہ تاسیس کی ہے یا تجدید کی۔ یعنی اس کی ضرورت ہے کہ از سر نو نئی باتیں، نئے طریقے، نئے ڈھنگ،

نئے نظام اور نئی نئی چالیں اختیار کی جائیں۔ یا صورت حال یہ ہے کہ پہلے سے ایک کارخانہ ملت موجود ہے۔ جس کو اپنی بقا اور ترقی کے لئے کسی نئی بات کی احتیاج نہیں۔ بلکہ طرح طرح خرابیاں عارض ہو گئی ہیں۔ اور بہت سی نئی نئی بڑھاوی گئی ہیں۔ پس ضرورت اس امر کی ہے کہ خرابیاں دور کر دی جائیں۔ چھوٹی ہوئی چیزیں واپس لے لی جائیں اور اس کو ویسا ہی بنا دیا جائے جیسا کہ اصل میں تھا۔ تاسیس کے معنی تو یہ ہوئے کہ آپ نے ایک نئی تعمیرات تیار کی اور اس کو از سر تو تعمیر کر کے بنایا۔ تجدید یہ ہوئی کہ مکان پہلے سے موجود ہے۔ صرف شکست وریخت کی درستگی مطلوب ہے۔ پس آپ نے نقائص دور کر کے درست کر دیا ہم کو غور کر لینا چاہیے بنائے ملت کی درستگی کے لئے تعمیرات اساسیہ مطلوب ہیں یا صرف اصلاحات تجدیدیہ۔ پس اگر تاسیس مطلوب ہے تو بلا شبہ ہمارا پہلا کام یہ ہوگا کہ نئے نئے ڈھنگ اختیار کریں۔ لیکن اگر تجدید کی ضرورت ہے تو ہمیں نئی نئی چیزوں کی ضرورت نہ ہوگی۔ صرف یہ دیکھنا ہوگا کہ پہلے سے جو چیزیں موجود ہیں' ان کا کیا حال ہے اور ان میں جو جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں وہ کیونکر دور کی جا سکتی ہیں۔ حضرات! دین کامل ہو چکا ہے اور اتمام نعمت کا اعلان کر دیا گیا ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ آج ہم نے تمہارے دین کو کامل کر کے اپنی نعمت تم پر پوری کر دی ہے اور وہ دین پسندیدہ اسلام ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں میں ایک فرد بھی ایسا نہ ہوگا جو یہ کہے کہ اصلاح ملت اسلامیہ کے لئے شریعت قرآنیہ کی تعلیمات و نظامات کافی نہیں ہیں اور ہمیں غیروں کی تقلید اور دریوزہ گری کی ضرورت ہے۔ پس یہ اصل

تو متفق و مسلم ہے کہ راہ اصلاح میں ضرورت صرف تجدید کی ہے تاسیس کی نہیں اور خود شارع علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات نے بھی ہمیں تجدید کی خبر دی تھی نہ تاسیس کی جیسا کہ ابو داؤد میں ابو ہریرہ سے روایت ہے۔

اَنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ فِی ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَاْسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا میری امت کی خاطر اللہ تعالیٰ ہر سو سال میں ایک مجدد بھیجے گا جو تجدید دین کرے گا۔ لیکن میں عرض کروں گا کہ اگر یہ سچ ہے تو عملاً نتیجہ اس اعتقاد کا یہ ہونا چاہیئے کہ ہمارا قدم طلب اصلاح میں تاسیس کی طرف نہ جانے اور وقت کے نظر فریب اسلوب کار علی الخصوص یورپ کے مجلسی و اجتماعی طریقے ہمیں نظم شرعی سے روگرداں نہ کریں۔ افسوس کہ اس وقت تک تمام داعیان اصلاح کا طرز عمل اس کے مخالف رہا ہے اور یقین کیجیے کہ یہی علت ہے کہ اس وقت تک ہماری کوئی اصلاح و ترقی، فوز و فلاح نہ پا سکی۔ اسلام اگر دین کامل ہے تو ضرورت ہے کہ اس نے اپنے پیروؤں کی تمام افرادی و اجتماعی اور مدنی ضروریات کے لئے کامل و اتم تعلیم دے دی ہو۔ اور اگر وہ دین آخری ہے تو ضروری ہے کہ اس کی تعلیم اور شارع کی سنت ہر عہد، ہر زمانے اور ہر حالت اور عسر و شکل و ضیق کے لئے رہ نما و کفیل ہو۔ ہمارا ایمان ہے کہ حقیقت ایسی ہی ہے اور اسلام نے ہمارے تمام اجتماعی و قومی برکات کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ لیکن پھر یہ کیا مصیبت ہے کہ ہم ان کھوئی ہوئی برکتوں کو واپس نہیں لینا چاہتے بلکہ نئی نئی راہوں کی جستجو میں حیران و سرگرداں ہیں۔ حضرات! غور سے سنو کہ قوم، افراد سے مرکب ہے کہ ایک جماعتی سلک میں تمام افراد منسلک ہو جائیں۔ اور تفرقہ و تشتت کی جگہ، وحدت و اتحاد

پر افراد قوم کی شیرازہ بندی کی جائے۔ ہم اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور یورپ کے اجتماعی طریقوں کی نقالی کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ آخر اسلام نے بھی حیات اجتماعی کے لئے کوئی نظم ہمیں دیا تھا یا نہیں۔ اگر دیا تھا اور ہم نے اسے ضائع کر دیا ہے تو یورپ کی دریوزہ گری سے پہلے خود اپنی کھوئی ہوئی چیز کیوں نہ واپس لے لیں اور سب سے پہلے اسلام کا قرار دادہ نظام جماعتی کیوں نہ قائم کریں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب تک مجالس نہ ہوں، اجتماعات نہ ہوں، انجمنیں نہ ہوں، کانفرنسیں نہ ہوں تو کوئی قومی عمل انجام نہیں پا سکتا۔ اتحاد و تعاون کی برکت حاصل ہو سکتی ہے۔ پس ہم آج کل کے مجلسی طریقوں کے مطابق انجمنیں بناتے ہیں۔ کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں۔ مگر ہم میں سے کسی کو کبھی اس کا خیال نہیں آتا کہ اسی مقصد اجتماع و تعاون کے لئے اسلام نے بھی پانچ وقت کی نماز با جماعت، جمعہ، عیدین، حج کا حکم دیا ہے اور اس کا نظام و قوام درہم ہو گیا ہے۔ سب سے پہلے اسے کیوں نہ درست کر لیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب تک کوئی قومی فنڈ نہ ہو، اس وقت تک قومی اعمال انجام نہیں پا سکتے۔ پس ہم نئے نئے فنڈ قائم کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے مگر کاش کوئی یہ بھی سوچے کہ خود شریعت نے اس ضرورت کو رفع کرنے کے لئے زکوٰۃ و صدقات کا حکم دیا ہے۔ اس کا نظم ٹھیک ہے کہ نہیں، اگر وہ قائم ہو جائے تو پھر بھی کبھی کسی فنڈ یا چندہ کی ضرورت ہوگی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قوم کی تعلیم عام کے لئے مجامع و محافل کی ضرورت ہے۔ ہم اس کے لئے نئی نئی تدبیریں کرنے لگتے ہیں۔ مگر کبھی یہ حقیقت ہمارے دلوں کو بیدار نہیں کرتی کہ عین اسی مقصد سے شریعت نے خطبۂ جمعہ کا حکم دیا ہے اور ہم

نے اس کی برکتوں کا دروازہ اپنے اوپر بند کر لیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی قومی واجتماعی کام انجام پا نہیں سکتا کہ جب تک اس میں نظم و انضباط نہ ہو۔ اور یہ ہو نہیں سکتا جب تک کہ اس کا کوئی صدر تلاش کریں۔ لیکن اگر یہی حقیقت، شریعت کی ایک اصطلاح امامت کے لفظ میں ہمارے سامنے آتی ہے تو ہمیں تعجب و حیرانی ہوتی ہے اور اس کے لئے ہم تیار نہیں ہوتے۔ ان مثالوں سے مقصود یہ ہے کہ ہمارے لئے راہ عمل تجدید و احیا ہے۔ نہ کہ تاسیس و اختراع۔ پس کسی طرح بھی یہ طریق صواب نہ ہوگا کہ علماء و قائدین کی جمعیت بھی اپنے نظام و قوام کے لئے محض آجکل کی مجلسوں کے قاعدوں کی نقل و محاکات پر اکتفا کرلے۔ کیونکہ قائدین امت مرحومہ کا مقام اس سے بہت بلند ہے کہ عمل کے لئے ان مجلسوں کے ڈھنگوں اور طریقوں کے محتاج ہوں۔ ان کی راہ تو اتباع شریعت اور اہتداء بہ مشکوٰۃ نبوت کی ہے اور اسوۂ حسنۂ نبوت اور حکمت رسالت نے انہیں تمام انسانی طریقوں سے مستغنی و بے نیاز کر دیا ہے۔ ہمارا طریق عمل تو یہ ہونا چاہیے کہ ہم تمام انسانی طرف طریقوں سے حکمت اجتماعیہ نبویہ کو اپنا دستور العمل بنائیں۔ شریعت کے کھوئے ہوئے نظام کو از سر نو قائم و استوار کریں۔ اور اس طرح اسلام کی مٹی ہوئی سنتیں، زندہ ہو جائیں، محض مجلس آرائی و ہنگامہ سازی ہمارے لئے کچھ سود مند نہیں ہو سکتی۔

حضرات! آج وقت کی سب سے بڑی مہم اور ادائے فرض اسلامی کی سب سے نازک اور فیصلہ کن گھڑی ہے۔ جو آزادی ہند اور مسئلہ خلافت کی شکل میں ہمارے سامنے آگئی ہے، ہندوستان میں دس کروڑ مسلمان ہیں جو اس وقت مسئلہ

غفلت تھے اور اب آمادہ ہوئے ہیں۔ کہ اطاعت و اعانتِ خلیفہ۔ عہدِ حفظ و حمایتِ بلادِ اسلامیہ اور آزادی ہندوستان کی راہ میں اپنا اولین فرض اسلامی سرانجام دیں۔ خدارا بتلائیے کہ اس صورت حال کا طریق کار کیا ہونا چاہیئے۔ اور ایسے وقتوں کے لئے آخر اسلام نے بھی کوئی نظام بتلایا ہے کہ نہیں، یا وہ باوجود دعوائے تکمیل شریعت، اس قدر نامراد ہوگیا ہے کہ آج اس کے پاس وقت کی مشکل و مصیبت کا کوئی حل نہیں۔ اگر بتلایا تو وہ کیا ہے ..... یا محض انجمن سازی اور ہنگامہ مجلس آرائی ہے۔ یا محض اتباع آرائے رجال اور تقلید ارباب ظن و تخمین ہے۔ میں علیٰ وجہ البصیرت اعلان کرتا ہوں کہ اس بارے میں بھی شرعی راہ صرف وہی ایک ہے اور جب تک وہ ظہور میں نہ آئے گی۔ ہماری کوئی سعی

بھی شرعی راہ صرف وہی ایک ہے اور جب تک وہ ظہور میں نہ آئے گی۔ ہماری کوئی سعی مشکور نہیں ہو سکتی۔ اور کوئی کوشش بھی بار آور ثابت نہیں ہو سکتی۔ اور جس طرف آج ہمارے لیڈر و قائد ہمیں لے جا رہے ہیں کہ ہر بات میں یا یورپ کی تقلید کی جائے اور یا پھر دوسرے ابناء وطن کے طریق کار کی نقل اتاریں۔ اور ان کی اقتدا کی جائے۔ یقیناً یہ تباہی و ہلاکت کی راہ ہے۔ وَاَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ کہ قوم کی تباہی و ہلاکت کے گڑھے میں گرا رہے ہیں۔ ہمارے سامنے صرف ایک راہ ہے اور وہ ہے قرآن کی راہ بَلْ نَتَّبِعُ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ط کہ ہم تو صرف ملت ابراہیمی کی اطاعت کریں گے۔ اور دوسری کوئی راہ نہیں جس کی ہم اطاعت کر سکیں۔ اور یہی وہ صراط مستقیم ہے کہ آدم نے بھی اسی پر قدم رکھا اور نوح نے بھی پھر دنیا کی بارش میں اس کا وعظ کیا۔ اور ابراہیم نے

اس کی نشاندہی کے لیے قربان گاہ بنائی۔ اور اسمٰعیل نے اسی کی اینٹیں چنیں یوسف نے مصر کے قید خانہ میں اسی کا اعلان کیا تھا۔ موسیٰ پر وادی طوی میں اس کی روشنی اور تجلی پڑی تھی۔ اور گلیل کا اسرائیل واعظ جب یروشلم کے نزدیک ایک پہاڑ پر چڑھا تو اس کی نظر اسی راہ پر تھی۔ اور پھر جب خداوند سعیر سے چمکا اور فاران کی چوٹیوں پر نمودار ہوا تو وہی راہ تھی جس کی طرف اس نے دنیا کو دعوت دی کہ هٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا۔ یہ ہے میری راہ۔ فَاتَّبِعُونِي پھر تم میری اتباع کرو۔ پھر خدارا بتلاؤ آج ہم اس راہ کو چھوڑ کر کدھر جائیں۔ اور آج اس سراج منیر کو پس پشت ڈال کر کس سے روشنی حاصل کریں۔ پس یہی ہمارا ایمان ہے اور یہی ہمارا راستہ ہے اب ہم اس نشست میں اسی کو بیان کرتے ہیں۔

تقلید کا دیوتا سنگِ راہ ہے

ہر اصلاحی تحریک و دعوت کے لیے پہلی منزل تقلید کی بندشوں کو توڑنا ہے کیونکہ تقلید کے اہر من سے بڑھ کر ان کے تمام یزدانی خصائل کا اور کوئی دشمن نہیں۔ انسانی اعمال کی جس قدر گمراہیاں ہیں، ان سب کی تخم ریزی صرف صرف تقلید ہی کی سرزمین میں ہوتی ہے۔ اس لیے راہِ اصلاح کا اولین منظریہ ہے کہ تقلید پرستی کے سلاسل واغلال انسانوں کو نجات حاصل ہو خدائے تعالیٰ نے ہر انسانی دماغ کو سوچنے والا اور ہر آنکھ کو دیکھنے والا بنایا ہے۔

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ الآیۃ

کیا ہم نے انسان کو دیکھنے کے لیے آنکھیں نہیں دیں اور بولنے کے لیے

زبان اور بیان نہیں عطا کیں۔ اور پھر ہدایت و ضلالت کی دونوں راہیں اس کے سامنے نہیں کھول دیں۔

اس لئے ہر انسان اپنی ہدایت و گمراہی کا ذمہ دار اور اپنے فکر و دماغ سے کام لینے کے لئے خود مختار ہے۔ لیکن انسان کی تمام قوتیں نشو و نما کی محتاج ہیں اور نشو و نما ہو نہیں سکتی جب تک قوتوں کو بغیر سہارے کے خود ورزش کرنے کے لئے چھوڑ نہ دیا جائے۔ انسان چلنے کی قوت اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ مگر بچے کو جب تک خود کھڑا ہونے اور پاؤں پر زور دینے کے لئے چھوڑ نہ دیجئے گا۔ کبھی اس کے پاؤں نہیں کھلیں گے۔ تقلید سے پہلی ہلاکت جو انسانی دماغ پر چھا جاتی ہے وہ یہی ہے کہ انسان اپنے چند پیشواؤں اور مقتداؤں کی تعلیم یا آباؤ اجداد کے طریق و رسوم پر اپنے تئیں چھوڑ دیتا ہے اور صرف انہی کا تعبد کرتے کرتے خود اپنی قوتوں سے کام لینے کی عادت بھی بھول جاتا ہے۔ اس عالم میں پہنچ کر اس کی حالت بالکل ایک چارپائے کی سی ہو جاتی ہے۔ اور انسانی ادراک و تعقل کی تمام صلاحیتیں مفقود ہونے لگتی ہیں۔ انسان کا اصل شرفِ نوعی اور مابہ الامتیاز اس کے دماغ کا تدبر و تفکر اور اجتہاد و تجسس ہے۔ دنیا میں جس قدر علوم و فنون کا انکشاف ہوا نوامیس الٰہیہ اور نوامیس فطریہ کے چہروں سے جس قدر پردے اٹھے، اشیاء کائنات کے خواص کا جو کچھ سراغ لگا۔ تمدن و مصنوعات میں جس درجہ ترقیاں ہوئیں نئے نئے حالات اور نئے نئے وسائل راحت جس قدر ایجاد ہوئے غرض کہ انسان کے ارتقاء ذہنی و فکری کے جس قدر کرشمے دنیا میں نظر آرہے ہیں، یہ تمام تر اسی انسانی تدبر و تفکر کے نتائج

ہیں۔ لیکن تقلید پرستی کی عادت، ہلاکت و بربادی کی ایک چٹان ہے جو انسانی تدبر و تفکر اور ادراک اور تعقل کی تمام قوتوں کو کچل ڈالتی ہے۔ اور اس کی قوت نشوونما کا دائمی سدباب کر دیتی ہے۔ قرآن کریم جس دعوت کو لے کر آیا، فی الحقیقت اس کا اصل مقصد یہی تھا کہ تقلید اور استبداد فکری کی زنجیروں سے انسان کو نجات دلائے بت پرستی اور انسان پرستی کی تمام شاخیں بھی اسی تقلید آبا و رسوم سے پیدا ہوتی ہیں، اسی لئے قرآن کریم نے اپنی تعلیم توحید کا اساس بھی انسان کی اجتہاد فکری پر رکھا اور تفکر پر زور دیا۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا ط کیا لوگ اپنے دماغ سے قرآن پر غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر قفل لگ گئے ہیں۔ مقلدین محض کو چار پاؤں اور حیوانوں سے تشبیہ دی ہے۔ اور پھر اس کو بھی اظہار ضلالت کے لئے ناکافی قرار دے کر ان سے بھی بدتر فرمایا

لَھُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ بِھَا وَلَھُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِھَا وَلَھُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِھَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ ط

ان کے پاس دل و دماغ ہیں مگر نہیں سمجھتے، آنکھیں ہیں پر نہیں دیکھتے کان ہیں پر نہیں سنتے، خود اپنے ذہن سے کام نہ لینے اور مقلد محض ہونے میں وہ مثل چارپایوں کے ہیں بلکہ ان سے بھی گمراہ تر۔

پس خواہ مذہبی اصلاح ہو یا اخلاقی، تمدنی ہو یا سیاسی ہر راہ میں پہلا پتھر تقلید کا حائل ہوتا ہے۔ اور اگر یہ ہٹ جائے تو پھر آگے کے لئے راہ صاف

ہے۔ ہم کو مسلمانوں کے موجودہ سیاسی تغیرات میں سب سے زیادہ مہلک اور تباہ کن جو چیز نظر آرہی ہے وہ یہی لیڈروں کی تقلید پرستی ہے۔ اب فی الحقیقت پالٹیکس میں نہ تو قوم کی کوئی پالیسی ہے، اور نہ کوئی رائے صرف چند ارباب عروج واقتدار ہیں جو اپنے محلوں میں بیٹھ کر تجویز بافی کر لیتے ہیں، پھر تمام قوم کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر ان کے ہاتھوں میں اپنی چھڑی پکڑا دیتے ہیں اور وہ کولھو کے بیل کی طرح ان کے بنائے ہوئے مرکز ضلالت کا طواف کرتی رہتی ہے۔ اصل قوت، عام قوم کی ہے۔ اور سچی پالیسی وہی ہے جو خود قوم کے دماغوں میں پیدا ہوئی ہو۔ لیڈروں کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کی نگہداشت کریں۔ اور اس کو صحیح اور باقاعدہ تنظیم کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھیں۔ لیکن افسوس کہ مسلمان لیڈروں نے نہ تو کبھی خود قوم کو سوچنے اور سمجھنے کا موقع دیا اور نہ خود قوم کو اپنے ذاتی اجتہاد فکری اور قوت تدبر و فکر سے کام لینے کی مہلت ملی ابتدا سے لیڈروں کی یہی تعلیم رہی کہ تقلید و اتباع پر قناعت کرو اور جو کچھ کہا جائے اس پر چون و چرا مت کرو۔ کیونکہ ابھی تم میں تعلیم نہیں۔ اور کئی صدیوں تک چارپایوں کی سی زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور رہو۔ نعوذ باللہ، پیشوایان قوم کا صحیفہ تعلیم بھی کلام الٰہی تھا۔ کہ

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ط

جب قرآن کریم پڑھا جائے تو پوری توجہ اور انقطاع کے ساتھ سنو اور چپ رہو تاکہ تم پر اللہ کی نظر رحم مبذول ہو۔

پس ہر تحریک اصلاح اور جدوجہد تعمیر کے لئے تقلید پرستی کے سنگ راہ

کو راستے سے ہٹانا اولین فرض ہے اور اس کے بغیر ہر سعی عمل بے نتیجہ اور ہر کوشش رائگاں ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ تقلید پرستی کے مہلک مرض کا سرچشمہ اور منشاء و مبداء احبار کی، وہ اُن کی سطوت و جبروت ہے۔ پس تقلید کے قید خانہ سے آدمی اس وقت تک نہیں نکل سکتا جب تک پیشواؤں کے رعب و جبروت کی زنجیروں سے رہائی نہ پائے۔ انسان کے نظام دماغی پر صرف اعتقادات کی حکومت ہے، اس کے تمام حواس اسی کے ماتحت۔ اور تمام اعمال و افعال اسی سے وابستہ ہیں۔ پس جب اس کا دماغ کسی خارجی عظمت و جبروت کے اثر سے مرعوب ہو جاتا ہے تو اس کے تمام اعمال و معتقدات میں اس مرعوبیت کا اثر سرایت کر جاتا ہے۔ بلکہ وہ جو کچھ دیکھتا ہے اور سنتا ہے وہ بھی اس مرعوبیت کے اثر سے خالی نہیں ہوتا۔ چونکہ اس کی قوت فکری بے کار ہو جاتی ہے اس لئے یہ مرعوبیت جو کچھ دکھاتی ہے دیکھتا ہے۔ اور جو یقین دلاتی ہے یقین کرتا ہے ایک بت پرست جب انتہا درجہ کی عاجزی کے ساتھ ایک پتھر کی مورتی کے آگے سر ٹیکتا ہے تو کیا اس کا دماغ مختل ہو جاتا ہے؟ کیا اس کی قوت بصارت جواب دے جاتی ہے؟ سوچنے اور سمجھنے والی قوت اس کے دماغ سے اس وقت چھین لی جاتی ہے؟ کیا کوئی خاص قوت تفکر موحد اور اللہ پرست انسان کو نصیب ہے۔ جو بت پرستوں کو نصیب نہیں؟ پھر کیا بات ہے کہ ہم کو جو شے محض پتھر کا ایک ٹکڑا نظر آتی ہے جو مَا لَا یَنفَعُهُمْ وَلَا یَضُرُّهُمْ کا درجہ رکھتی ہے، اسی شے میں بت پرست انہی قوتوں اور عظمتوں کا کرشمہ دیکھتا ہے۔ اور جو قوت فکری ہمیں اس پر ہنساتی ہے وہی اس کی طاقتوں کا اسے یقین دلاتی ہے۔ اس کا اصل سبب یہی ہے کہ تقلید آباء و رسوم نے اُن بتوں کی

عظمت و جبروت سے اس کے دماغ کو مرعوب کر دیا ہے۔ اور تمام قوتیں و حواس گو قائم اور صحیح ہیں مگر اس رعب و سطوت کے بوجھ سے اس طرح دب گئی ہیں کہ ان کو اپنے اعمال پر غور و فکر کا موقع ہی نہیں ملتا۔ قوت فکری ضرور اس کے دل میں شکست اور تزلزل پیدا کرے کہ ان بتوں میں دھرا ہی کیا ہے۔ مگر مرعوبیت اس کی مہلت ہی نہیں دیتی۔ آنکھیں ضرور اس کو دکھلائیں کہ یہ ایک حقیر و ذلیل پتھر ہے مگر مرعوبیت کی یاندھی ہوئی پٹی دیکھنے ہی نہیں دیتی، اس کے پاس غور و فکر کی وہ تمام قوتیں موجود ہیں جو ایک موحد اور ملک السمٰوات والارض پر غور کرنے والے حکیم کے پاس ہیں۔ مگر اعتقاد عظمت کا دیو انہیں اپنے پنجہ کی گرفت سے نکلنے نہیں دیتا، قرآن کریم نے اسی حالت کی نسبت فرمایا ہے۔

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ ۝ الآیۃ

گمراہوں کی آنکھیں اندھی نہیں جاتیں بلکہ دل اندھے ہو جاتے ہیں۔ جو ان کے سینوں میں ہیں۔

یہ حالت عام ہے اور اس کی نظیر انسانی اعمال کی ہر شاخ میں مل سکتی ہیں، مذہب کی طرح پالٹیکس میں بھی مسلمانوں پر اپنے پیشواؤں کی عظمت و جبروت کا رعب اس طرح چھایا ہوا ہے کہ ان کو کبھی خود غور کرنے اور اپنی حالت کو سمجھنے کی جرات ہی نہیں ہو سکتی۔ اگر کبھی کسی شخص کے دل میں شک و شبہ پیدا بھی ہو جائے تو اس مرعوبیت کے استیلا سے شکست کھا جاتا ہے۔ پس مصلح کے لیے سب سے پہلا کام قوم کے قلب و دماغ سے لیڈروں کی اس رہبانی سطوت اور احبار کی جبروت و قہرمانی کے کابوس کو نکالنا ہے۔ تاکہ تقلید کی بندشیں توڑ کر

قوم کو صراطِ مستقیم پر گامزن کرا کے منزلِ مقصود کی جانب حرکت دی جائے یہی وجہ ہے کہ پیغمبروں اور ان کے جانشینوں کو ہمیشہ اسی بنایش کے توڑنے اور سنگِ راہ کو ہٹانے میں بڑے سے بڑے مصائب پیش آئے لیکن جب یہ بند ٹوٹ گیا تو وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللهِ أَفْوَاجًا ہ لوگ جوق در جوق، فوجوں کی فوجیں دعوت پر لبیک کہنے لگیں۔ هٰذَا مَا عِنْدِي وَالْعِلْمُ عِنْدَ اللهِ

قرآنی مشعلِ راہ ضروری ہے

لیکن یہ جو کچھ کہ بیان ہوا تصویر کا ایک رخ ہے یہ صرف سلبی پہلو ہے۔ اور اسلام کا کوئی نظام اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ سلب کے ساتھ ایجاب نہ ہو۔ اسی لئے ...... اس کے ہر نظام واصول کی تکمیل، سلب وایجاب، نفی واثبات دونوں سے مل کر ہوتی ہے اسلام کا اساسی میثاق جس کو شریعت کی زبان میں کلمۂ طیبہ کہا جاتا ہے نفی واثبات دونوں سے مرکب ہے پس ضروری ہے کہ ارتقاءِ اُمم کا قانون بھی سلب وایجاب سے مرکب ہو، اس کے اجزاءِ ترکیب میں دونوں کا وجود ناگزیر ہے تاکہ اجزاءِ سلبیہ لوحِ قلب کو تقلیدِ اغیار سے صاف کریں اور ایجابی اجزاء کے نقوش اس پر کندہ کئے جائیں اگر سلب نے تجلیہ کیا ہے تو ایجاب تحلیہ کا کام کرے اور انسانی قلوب مجلّٰی ومحلّٰی ہو کر ارتقائی منازل طے کریں۔ اس لئے پہلی بحث میں ہم نے سلب ونفی پر روشنی ڈالی تھی۔ اب اس بحث میں اثبات وایجاب پر کچھ نوکِ قلم کے سپرد کرتے ہیں۔ پس جیسے سلب میں ہر ماسوائے اللہ کی تقلید کی زنجیروں کو توڑنا ضروری ہے۔ ایسے ہی ایجاب میں صرف حکم خداوندی کا طوق

گلے میں ڈالنا ہے۔ انسان دنیا میں ہر طاقت کی غلامی سے آزاد پیدا ہوا ہے اور صرف اسی ایک کی غلامی کے لئے آیا ہے اور اس کی غلامی اس کے قانون کی تقلید و پیروی و اتباع ہے، ہمارے پاس اگر کچھ ہے تو قرآن ہی ہے۔ اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے۔ ساری دنیا کی طرف سے ہماری آنکھیں بند ہیں اور تمام آوازوں سے کان بہرے ہیں۔ اگر دیکھنے کے لئے روشنی کی ضرورت ہے تو یقین کیجئے کہ ہمارے پاس تو سراج منیر کی بخشی ہوئی ایک ہی روشنی ہے۔ اسے ہٹا دیجئے گا تو بالکل اندھے ہو جائیں گے۔

کِتَابٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ

(ترجمہ) قرآن ایک کتاب ہے جو تم پر نازل کی گئی اس لئے کہ انسان کو تاریکی سے نکالے اور روشنی میں لائے۔

ہمارے عقیدے میں ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا کسی اور تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو۔ ایک کفر صریح ہے۔ افسوس کہ لوگوں نے اسلام کو کبھی بھی اس کی اصلی عظمت میں نہیں دیکھا، مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ط ورنہ پولیٹکل پالیسی کے لئے نہ تو گورنمنٹ کے دروازے پر جھکنا پڑتا اور نہ ہندوؤں کے اقتدار کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ اسی سے سب کچھ سیکھتے جس کی بدولت تمام دنیا کو آپ نے سب کچھ سکھلایا تھا۔ اسلام۔ انسان کے لئے ایک جامع اور اکمل قانون لے کر آیا ہے اور انسانی اعمال کا کوئی مناقشہ نہیں کرتا۔ کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والے کسی دوسرے دروازے کے سائل بنیں۔ مسلمانوں کی اخلاقی زندگی کے لئے ایک اکمل ترین قانون اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا کا آخری اور عالمگیر مذہب نہ

ہو سکتا، وہ خدا کی آواز، اور اس کی تعلیم گاہ، خدا کا حلقہ درس ہے۔ جس نے خدا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ پھر کسی انسانی دستگیری کا محتاج نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ہر جگہ اپنے تئیں امام مبین، حق المبین، نور، کتاب مبین۔ تبیاناً لکل شئی ط بصائر للناس ط ھادی ط ھدی ط اھدی الی السبیل بلاغ للناس، ذکر، تذکرۃ، روح، شفاء، موعظۃ، حکمۃ، حکم، حاوی بحر و بر، جامع اضراب وامثال، فرقان، کتاب حکیم ٥ اور اسی طرح کے ناموں سے یاد کیا ہے۔ اکثر موقعوں پر کہا گیا روشنی ہے۔ اور روشنی جب نکلتی ہے تو ہر طرح کی تاریکی دور ہو جاتی ہے۔ خواہ مذہبی گمراہیوں کی ہو یا سیاسی کی۔ دنیا میں کون سی کتاب ہے جس نے اپنے متعلق اپنی زبان سے ایسے عظیم الشان دعوے کیے ہوں۔

قد جاءکم من اللہ نور و کتاب مبین ٥ یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلام و یخرجھم من الظلمات الی النور باذنہ و یھدیھم الی صراط مستقیم ٥

(ترجمہ) بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور ہر بات کو بیان کرنے والی کتاب آئی ہے۔ اللہ اس کے ذریعے سے سلامتی کے راستوں پر ہدایت کرتا ہے، اس کو جو اس کی رضا چاہتا ہے اس کو ہر طرح کی گمراہی کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لاتا اور سیدھی راہ چلاتا ہے۔

اس آیت میں صاف بتلا دیا ہے کہ قرآن مجید روشنی ہے اور انسانی اعمال کی تمام تاریکیاں صرف اسی سے دور ہو سکتی ہیں۔ پھر کہا کہ وہ ہر بات کو کھلے

طور پر بیان کر دینے والی ہے۔ اور انسانی اعمال کی کوئی شاخ ایسی نہیں جس کے اندر کوئی فیصلہ نہ ہو۔ اس ٹکڑے کی تائید دوسری جگہ کر دی۔

وَلَقَدْ جِئْنَاهُم بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ الآیہ۔

بے شک ہم نے ان کو کتاب دی جس کو ہم نے علم کے ساتھ مفصل کر دیا ہے۔ وہ ہدایت بخش اور رحمت ہے ارباب ایمان کے لئے۔

پھر غور کرو کہ پہلی آیت میں قرآن کو سبل السلام کے لئے ہادی فرمایا کہ وہ تمام سلامتی کی راہوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور اگر آپ کے سامنے پولیٹیکل اعمال کی بھی کوئی راہ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی سلامتی آپ کو قرآن کے اندر نہ ملے۔ پھر کہا کہ وہ انسان کو تمام گمراہیوں کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لاتا ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری پولیٹیکل گمراہیاں صرف اس لئے ہیں کہ ہم نے قرآن کے دست رہنما کو اپنا ہاتھ سپرد نہیں کیا ورنہ تاریکی کی جگہ آج ہمارے چاروں طرف روشنی ہوتی۔ آخر میں کہہ دیا کہ وہ صراط مستقیم پر لے جانے والی ہے۔ اور صراط مستقیم کی اصطلاح، قرآن مجید میں امور مہم سے ہے۔ ایسی جامع و مانع اصطلاح ہے جس کی نظیر نہیں۔ ایک جگہ فرمایا

أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ الآیۃ

ہم نے تجھ پر ایک ایسی کتاب اتاری جو ہر چیز کو کھول کر بیان کر دینے والی اور ہدایت و رحمت ہے صاحبان ایمان کے لئے۔

سورۂ یوسف کے آخر میں فرمایا۔

مَا كَانَ حَدِيثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ط

(ترجمہ) قرآن، بنائی ہوئی بات نہیں ہے بلکہ جو صداقتیں پہلے کی موجود ہیں ان کی تصدیق کرتا ہے اور اس میں ارباب ایمان کے لئے ہر چیز کا تفصیلی بیان اور ہدایت و رحمت ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ط

ہم نے انسان کے سمجھانے کے لئے اس قرآن میں سب طرح کی مثالیں بیان کر دی ہیں تاکہ لوگ نصیحت و عبرت حاصل کریں اور راہ ہدایت پائیں۔ ان آیات میں قرآن کا دعوئے بالکل صاف ہے، وہ ہر طرح کی تعلیمات کے لئے اپنے تئیں ایک کامل معلم ظاہر کرتا ہے۔ پھر مزید براں یہ کہ اس کی تعلیم صاف اور غیر پیچیدہ ہے بشرطیکہ اس میں تدبر و تفکر کیا جائے اس کی تعلیم میں کسی طرح کا داؤ پیچ نہیں ہے ہر طرح کے الجھاؤ سے پاک ہے اس میں کوئی بات الجھی ہوئی نہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا

تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے اپنے بندہ پر قرآن اتارا جس میں کوئی پیچیدگی نہیں۔

پس یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ اسی کے ماننے والے زندگی کے کسی شعبہ میں دوسروں کے سائل بنیں حالانکہ خود قرآن ان کے پاس حکم موجود ہے۔

وَکُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰہُ فِیْٓ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ ط اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ حیات کے مسائل کو ہم نے اس کتاب واضح میں جمع کر دیا ہے اور ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّہٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ط وَّمَا ھُوَ بِالْھَزْلِ ط بیشک یہ قرآن قولِ فیصل ہے۔ تمہارے اختلافات واعمال کے لئے اور کوئی بے معنی و فضول بات نہیں۔

مسلمانوں کی ساری مصیبتیں صرف اسی غفلت کا نتیجہ ہیں کہ انہوں نے ایسی تعلیم گاہ چھوڑ دیا۔ اور سمجھنے لگے۔ کہ صرف روزہ نماز کے مسائل کے لئے اس کی طرف نظر اٹھانے کی ضرورت ہے ورنہ اپنے تعلیمی، سیاسی، تمدنی اعمال سے اسے کیا سروکار۔ لیکن وہ جس قدر قرآن سے دور ہوتے چلے جائیں گے اتنا ہی تمام دنیا ان سے دور ہوتی چلی جائے گی۔ لیکن آج خود مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ زبانی دعوے تو بہت ہیں۔ مگر عملاً قرآن سے اپنے اعمال دینویہ کو بالکل نکال دیا ہے اسی وقت کی پیش گوئی قرآن نے پہلے سے کر دی تھی کہ

وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا

قیامت کے دن رسول خدا عرض کریں گے کہ خدایا میری امت نے اس قرآن کو ہذیان سمجھا اور اس پر عمل نہ کیا بلکہ پس پشت ڈال دیا۔

ہم نہیں سمجھے کہ اگر نزولِ قرآن کے وقت مشرکین مکہ اس سے اعراض و اغماض کرتے تھے۔ تو ان میں اس سے زیادہ کیا تمرد و سرکشی تھی۔ جتنی آج صدیوں سے تمام مسلمانانِ عالم اور ان کا ہر طبقہ خواہ وہ رہبانیت دینی کا ہو یا معذلتشیان کر رہا ہے وہ اگر قرآن کی تلاوت کے وقت کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے تھے یا کعبہ کے اندر سیٹیاں اور تالیاں پیٹتے تھے تاکہ اس کی آواز

کسی کے سننے میں نہ آئے تو آج تو مسلمان کانوں کی جگہ دلوں کو بند کئے ہوئے ہیں اور شور مچانے کی جگہ خاموش ہیں مگر ان کے نفس انسانی ہنگاموں کا ایسا عمل مچا رہے ہیں کہ خدا کی آواز کسی کے کانوں میں نہیں پڑتی پس اے ساکنانِ ضلالت آبادِ دنیا، اور اے سرگرانِ خمارِ غفلت مدہوشی اور اے دل دادگانِ غفلت و بے ہوشی! ہم تم کو کیسے مسلمان سمجھیں اور اپنے آپ کو کس طرح تمہاری پیروی و اتباع کے لئے آمادہ کریں۔ اگر تم کہتے ہو کہ ہم نے تم کو زمرۂ کفار میں داخل سمجھا اور اسلام سے خارج۔ تو ہاں ایسا ہی سمجھا ہے قسم ہے خدائے محمدؐ و قرآن کی کہ ایسا ہی کہا ہے۔ پس کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک قرآن کو اپنے لئے مشعل راہ نہ بنائے۔ اس کارخانۂ ہستی میں اقوام و امم کی ترقی و عروج، قرآن ہی کی بدولت ہو سکتی ہے۔ اور یہی وہ مرقاتِ ترقی اور معراجِ ارتقار عروج ہے۔ جس پہ چل کر قوموں نے ترقی حاصل کی تھی۔ اور آج بھی کر رہی ہیں اور اسی کو چھوڑ کر ہم آج گرفتارِ غلامی و اسیر ہیں۔

هٰذا كِتَابٌ نَفَعَ اللهُ بِهِ أَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهِ آخَرِينَ ط

کامیابی کی چار منزلیں

تمہارے سامنے کوئی مقصد ہے جس کو تم حاصل کرنا چاہتے ہو اور اس کے حصول کے لئے تم بے قرار ہو۔ اس کی محرومی سے تم تلخکام ہو۔ تمہارا ایک مطلب ہے جس کے حاصل کرنے کی تم جستجو کر رہے ہو۔ کوئی مراد ہے جس کے تم متلاشی ہو۔ کوئی مقصد ہے جس کی طلب سے تم تشنہ کام ہو، اس کی طلب و تلاش میں تم سرگرداں ہو وہ اگر حاصل ہو جائے تو تم کامیاب و کامران ہو۔ اس کا حصول تمہاری جدوجہد کا نتیجہ و ثمرہ ہے جس کا پالینا تمہاری فلاح و کامیابی ہے، اس کا ملنا تمہارے دل کی تمنا و آرزو ہے۔ اسی کے ملنے میں تمہاری سرخروئی و سرفرازی ہے۔ وہی تمہارا انتہائے عروج ہے فرض کرو اگر وہ نہ حاصل ہو تو تم خائب و خاسر ہو، اور اس کے عدم حصول پر تم ماتم کناں و گریہ کناں ہو اس کا نہ ملنا ہی تمہاری ناکامی ہے۔ اس کو نہ پاکر ذلت و انحطاط کے گڑھے میں پہنچ جاتے ہو۔ وہی تمہاری رسوائی و اہانت ہے۔ اس سے بڑھکر نہ تمہاری کوئی بے عزتی ہو سکتی ہے اور نہ نامرادی و خسران۔

تو کیا ایسا مقصد اعلیٰ بغیر کسی شرط و قید کے حاصل ہو سکتا ہے۔ کیا ایسے اہم مقصد کے لئے کچھ کرنا نہ ہوگا پس قرآن کہتا ہے قومی و اجتماعی مقاصد علیا کے لئے بھی شرائط

و قیود دیں. جب تک وشرائط نہ پوری کی جائیں جماعتیں محروم و نامراد رہتی ہیں، اور یہی
ان کا خسران و محرومی ہے اور یہی ان کی رسوائی و ذلت ہے۔

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

گردش زمانہ شاہد ہے کہ ہر جماعت خسارہ میں گھری ہوئی ہے مگر وہی جو یہ
چار کام انجام دیں۔ ایمان لائیں، اور عمل صالح کریں، اور حق و صداقت کا اعلان کرتے
رہیں اور صبر کی بھی تلقین کریں۔

زمانہ اس لئے شاہد ہے کہ اس آسمان کے نیچے قوموں اور جماعتوں کی بربادی
و کامیابی اور ارتقاد انحطاط کی کہانی جتنی پرانی ہے اتنا ہی پرانا زمانہ بھی ہے۔ دنیا میں
اگر کوئی اس انقلاب اقوام کا ہم عمر ہو سکتا ہے تو وہ صرف زمانہ ہے پھر قوموں کی تباہی و
بربادی اور کامیابی و فلاح جو کچھ بھی ہوتا رہا ہے وہ زمانہ کی گود میں ہوا پس انقلاب امم
پر اگر کوئی چیز گواہ ہو سکتی تھی تو وہ صرف گردش ایام ہی تھے۔ اس لیے قرآن نے
زمانہ کو اس پر شاہد اور گواہ بنایا کہ زمانہ اور اس کی گردش ایام ہی تھے۔ اس لئے قرآن
نے زمانہ کو اس پر شاہد اور گواہ بنایا کہ زمانہ اور اس کی گردش و رفتار اس بات پر شاہد ہے
کہ کوئی قوم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک ان اصول چہارگانہ کو نہ اپنا لے
ہر جماعت خسارے میں رہے گی مگر ان چار دفعات پر عمل پیرا ہو۔ پس قرآن اعلان کرتا
ہے کہ اس آسمان کے نیچے نوع انسان کے لئے انسانوں کی تلاشوں اور جستجوؤں کے لئے
اور امیدوں و تمناؤں کے لئے بڑی بڑی ناکامیاں ہیں۔ اور گھاٹے اور ٹوٹے ہیں خسران اور
نامرادی ہے محرومی اور بے مرادی ہے۔ لیکن دنیا کی اس عام نامرادی سے کون انسان ہے

کون جماعت ہے کہ بچ سکتی ہے اور ناکامیابی کی جگہ کامیابی اور ناامیدی کی جگہ امید اس کے دل میں اپنا آشیانہ بنا سکتی ہے۔ وہ کون انسان ہیں وہ انسان جو کہ دنیا میں ان چار شرطوں کو قولاً و عملاً اپنے اندر پیدا کریں۔ جب تک یہ پیدا نہ ہوں گی اس وقت تک دنیا میں نہ کوئی قوم کامیاب ہو سکتی ہے اور نہ ملک حتیٰ کہ ہوا میں اڑنے والے پرند بھی کامیابی نہیں پا سکتے! ان چار شرطوں کے نام سے گھبرانہ جانا اگر ایک چیز عربی بھیس میں آجائے تو کیا تم انکار کر دو گے چاہے وہ پہچانی ہوئی ہو۔ پہلی شرط وہ ہے جس کا نام قرآن کی بولی میں ایمان ہے۔ الا الذین امنوا ۝ تم جبھی کامیابی پا سکتے ہو جب تمہارے بالوں کے اندر اور روح و فکر میں وہ چیز پیدا ہو جائے جس کا نام قرآن کی زبان میں ایمان ہے۔ ایمان کے معنی عربی زبان میں زوال شک کے ہیں یعنی کامل درجہ کا بھروسہ اور کامل درجہ کا اقرار تمہارے دل میں پیدا ہو جائے۔ جب تک کامل درجہ کا یقین تمہارے دلوں میں اندر پیدا نہ ہو اور اللہ کی صداقت و سچائی اور اللہ کے قوانین و اصولوں پر کامل یقین تمہارے قلوب میں موجزن نہ ہو جائے تب تک کامیابی کا کوئی دروازہ تمہارے لئے نہیں کھل سکتا۔ شک کا اگر ایک کانٹا بھی تمہارے دل کے اندر چبھ رہا ہے۔ تو تم کو اپنے اوپر موت کا فیصلہ صادر کرنا چاہیئے۔ تم کو کامیابی نہیں ہو سکتی۔ سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ تمہارے دلوں اور قلوب میں ایمان یعنی اطمینان یعنی یقین پیدا ہو ہو اور تمکن و اقرار پیدا ہو۔ دل کا یہ کام دماغ کا یہ فعل، تصور کا یہ نقشہ کامیابی کی پہلی منزل ہے۔ اگر اسی میں تمہارا قدم ڈگمگا رہا ہے۔ تو کامیابی کی بو بھی تم نہیں سونگھ سکتے۔ کیا تم شک کا روگ اپنے پہلوؤں سے لے کر دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی کامیابی بھی پا سکتے ہو۔ کیا تم دنیا میں ایک مٹھی بھر جو اور چاول پا سکتے ہو جب

تک تمہارے دلوں میں اس کے لیے یقین واعتماد، بھروسہ و اطمینان نہ ہو۔ دنیا میں کوئی مقصد بغیر اعتماد و بھروسہ کے حاصل ہو سکتا ہے۔ کیا چیونٹی سے لے کر ہاتھی کے کوہ پیکر وجود تک کوئی طاقت اپنا مقصد اور اس کے لئے جد وجہد و عمل کی سرگرمی بغیر عزم و ارادہ کے دکھا سکتی ہے۔ کیا عزم و ارادہ بغیر یقین و اطمینان کے پیدا ہو سکتا ہے اگر نہیں تو قرآن تم سے یہی مطالبہ کرتا ہے کہ اپنے اندر یقین و اعتماد پیدا کرو تاکہ تمہارے اندر عزم و ارادہ پیدا ہو۔ اور پھر تم سرگرم عمل ہو کر جد وجہد کرو۔ لیکن کیا حصول مقصد کے لئے دل کا یہ یقین اور دماغ کا یہ فعل کافی ہے اور منزل مقصد تک پہنچنے کے لئے اور کچھ نہیں؟ کیا اسی سے کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ فرمایا نہیں بلکہ ایک دوسری منزل اس کے بعد آتی ہے۔ جب تک وہ دوسری منزل بھی کامیابی کے ساتھ طے نہ کر لو گے اس ایک منزل کو طے کر کے کامیابی نہیں پا سکتے۔ اس کا نام قرآن کی زبان میں عمل صالح ہے وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ یعنی وہ کام جو اچھائی کے ساتھ کیا جائے جس کام کو جس صحت اور جس طریقے کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ جو طریقہ اس کے لئے سچا طریقہ ہو سکتا ہے۔ اس کام کو اس کے ساتھ انجام دیا جائے اس سے سادہ تر الفاظ میں یہ کہ جو طریقہ اس کام کے انجام دینے کا صحیح طریقہ ہو سکتا ہے اسی طریقہ کے ساتھ انجام انجام دیا جائے۔ قرآن کا یہ اصول تو عام ہے کیونکہ ایمان کے معنی ہیں وہ کامل یقین و کامل اطمینان اور اقرار جو عمل سے پہلے پیدا ہوتا ہے۔

فرض کرو کہ تمہارے سامنے ایک مکان ہے۔ جس وقت یہ ایک چٹیل میدان تھا۔ کوئی وجود اس عمارت و مکان کا نہ تھا۔ کسی کاریگر نے اس وقت

یہاں کوئی تعمیر نہ کی تھی۔ نہ دیواریں تھیں اور نہ چھت اور لالٹین وغیرہ کچھ بھی نہ تھا تو اس وقت بھی یہ مکان معہ اپنی لالٹینوں اور نقوش مزینہ کے موجود تھا۔ کہاں؟ اس کے دماغ میں! پس وہ چیز جو اس کے دماغ میں موجود تھی، وہ ارادہ جو اس کے دماغ میں پیدا ہوا تھا، وہ پہلی منزل ہوئی۔ جو مذہب میں آکر ایمان کا نام اختیار کر لیتی ہے۔ بالکل جیسے وہ عمل دماغ ہے ویسے ہی تصور و یقین بھی عمل قلب ہے۔ اور اسی کو قرآن ایمان کہتا ہے۔ اسی بنا پر سب سے پہلی منزل ایمان کی ہوئی۔ پس تجویز یہ ہے کہ پہلے تمہارے دل کے اندر سچا اطمینان و یقین اور صحیح ارادہ و عزم پیدا ہو۔ پھر صرف دماغ کی منزل طے کر کے قدم نہ ٹھہر جائیں۔ بلکہ ایک دوسری منزل عملوا الصالحات کی بھی ہے یعنی عمل صالح کی منزل یعنی جیسے تم مکان کی تعمیر کا کام شروع کر دو۔ تو جو طریقہ اس کے انجام دینے کا ہو، اسی طریقہ سے انجام دو گے تو مکان کی تعمیر پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیگی ورنہ نہیں۔ ایسے ہی یہاں بھی جس مقصد کو تم حاصل کرنا چاہتے ہو اس کے حاصل کرنے کے لئے جو عمل و سعی بھی کرو۔ وہ اسی طریقہ سے کرو۔ جو طریقہ اس کے کرنے کا ہے۔ اس کو بھی جب پورا کر لیا تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ فتح مندی اور کامیابی دو منزلیں تم نے طے کر لیں۔ مگر پھر کیا تمہارا کام ختم ہو گیا۔ اس کے بعد کیا تم منزل مقصود تک پہنچ جاؤ گے۔ قرآن کی عالمگیر صداقت کہتی ہے کہ نہیں۔ بلکہ ان دو منزلوں کے بعد دو منزلیں اور باقی ہیں۔ اپنی ہمت تو آزما لو کہ ان کے لئے تمہارے تلوے تیار ہیں یا نہیں۔ تمہاری کمر ہمت مضبوط ہے کہ نہیں۔ اگر نہیں تو ممکن ہے کہ دو منزلیں تمہارے لئے سودمند ہوں

یہ صرف ایک زنجیر کی کڑی کے ظاہر و باطن کی درستگی ہے لیکن کیا ایک کڑی کے درست ہو جانے سے پوری زنجیر کا کام پورا ہو جایا کرتا ہے۔ اگر نہیں تو تم اپنی جگہ ایک کڑی ہو۔ تمہارا وجود قومی زنجیر کی ایک کڑی ہے پس زنجیر کا کام بھی باقی ہے۔ تم کیا ہوا میں بکھری ہوئی شکل میں بیکار ہو اس میں تمہارا کوئی وجود نہیں۔ کیونکہ قرآن وجود مانتا ہے اجتماع کا نہ کہ کڑیوں کا۔ اس کے نزدیک وجود کڑیوں کا نہیں ہے بلکہ زنجیر کا ہے۔ تم میں سے ہر وجود ایک کڑی ہے اس کا کام پورا نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ وہ باقی کڑیوں کی خبر نہ لے۔ جب تک باقی کڑیاں منتشر حالت ہوں گی زنجیر مضبوط نہیں ہو سکتی اس لئے فرمایا کہ کامیابی کا سفر کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک تیسری منزل تمہارے سامنے نہ آئے وہ تیسری منزل ہے توجید حق کی وتواصوا بالحق ٥ یعنی ان دو منزلوں سے کامیابی کے ساتھ گزرنے کے بعد تیسری منزل کو بھی کامیابی سے طے کرو۔ یعنی دنیا میں خدا کی سچائی کا پیغام پہنچاؤ جب تک تم میں یہ بات نہ ہو کہ تمہارا دل سچائی کے اعلان کے لیے تڑپنے لگے تب تک تم کو کامیابی نہیں مل سکتی۔ لیکن اگر تم تیسری منزل کے لئے تیار ہو گئے۔ اگر توفیق الٰہی نے تمہاری دستگیری کی ہے اور تم نے یہ منزل بھی کامیابی کے ساتھ طے کر لی ہے تو کیا پھر مقصد حاصل ہو جائے گا۔ اور کچھ نہ کرنا پڑے گا۔ قرآن کہتا ہے نہیں بلکہ ایک اور آخری منزل بھی ہے۔ جو کہ اعلان صبر کی منزل ہے۔ وتواصوا بالصبر ٥ اعلان صبر کی منزل" اعلان حق کی منزل کے ساتھ لازم و ملزوم کا رشتہ رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ اس کی گردن

اس طرح جمڑی ہوتی ہے کہ جدا نہیں کی جا سکتی۔ فرمایا کہ حق کا وہ اعلان کریں گے۔ حق کا پیغام پہنچائیں گے۔ حق کا پیغام سنائیں گے، حق کی دعوت دیں گے۔ حق کی تبلیغ کریں گے۔ حق کا چیلنج کریں گے۔ حق کا پروپیگنڈا کریں گے۔ لیکن حق کا یہ حال ہے کہ حق کی راہ میں کوئی قدم نہیں اٹھ سکتا۔ جب تک کہ قربانیوں کے لئے نہ اٹھے۔ حق کا پیغام پہنچانا بغیر قربانی و ایثار کے ایسا ہی ہے جیسا آگ کو ہاتھ میں پکڑ لینا بغیر اس کی گرمی کے جیسے یہ ناممکن ہے ویسے ہی وہ بھی محال ہے، اس لئے چوتھی منزلِ صبر کی ہے۔ جب تک یہ منزل بھی طے نہ کی جائے، کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔

ڈرامہ نگاری کا فن

:- از پروفیسر محمد اسلم قریشی

اردو ڈرامہ نگاری کے فن پر پہلی مستند تصنیف جس میں ڈرامے کے فن، اس کی ابتدا اور ارتقاء کا تفصیلی مطالعہ ہے۔ اردو ڈرامہ کی ابتداء اس کے عہد بہ عہد ارتقاء کا تحقیقی کا جائزہ ہے۔ قدیم سے جدید ڈرامے تک تصاویر پوری کتاب کے مطالعے کے بعد آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ قیمت ۳۵/- روپے

اقبال کا فلسفہ خودی

:- از پروفیسر محمد عثمان

پروفیسر محمد عثمان نے اقبال کے فنی کمالات اور فلسفہ خودی پر ایک نئے زاویے سے نظر ڈالی ہے۔ پوری کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح اقبال نے فلسفہ خودی کو شعری قالب میں ڈھالا۔ یہ کتاب اقبالیات میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ قیمت ۲۰/- روپے

جدید تعلیمی نفسیات

از ڈاکٹر عبدالرؤف

ڈاکٹر عبدالرؤف ہند و پاک کے مشہور ماہر نفسیات ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب جدید تعلیمی قدروں سے روشناس کراتی ہے بلکہ روزمرہ پیش آنے والے تعلیمی مسائل، تعلیم کے جدید نظری اور عملی رجحانات کی نشاندہی کرتی ہے یہ کتاب تعلیمی نفسیات کے بنیادی نوعیت کے تمام نصابوں کے لئے ناگزیر کتاب ہے۔ قیمت ۲۵/- روپے

بچوں کی تربیت

از۔ ڈاکٹر عبدالرؤف

بچہ کی پیدائش سے قبل اور اس کے بعد کی حفاظت، نگہداشت اور جسمانی، دماغی، اخلاقی نشوونما کی تربیت داصولوں اور نگہداشت کے طریقے ہیں، والدین وسرپرستوں کے لئے ایک ضروری اور اہم کتاب، یہ کتاب ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔

قیمت -/۱۰ روپے

اوصاف اقبال

مرتبہ بہار آبادی

ہندو پاکستان کے ممتاز نقادوں اور ماہر اقبالیات کے مضامین کا خوبصورت مجموعہ جو ہندوستان میں پہلی بار شائع کیا گیا ہے۔ اہم ترین نقادوں و معاصرین کے اہم ترین مضامین کا گلدستہ جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ جس میں کتابت طباعت آفسیٹ و خوبصورت دسٹ کور۔ قیمت -/۵ روپے

ترقی پسند ادب

از۔ ڈاکٹر عزیز احمد

آزادی سے قبل سے آج تک کی مقبول عام کتاب۔ یہ ادب کے عام قارئین اور طلباء کی ضروریات کو پورا کرتی ہے بلکہ ترقی پسند ادب کا مختصر طور پر جائزہ بھی لیتی ہے۔ ایک عام فہم اور ادبی مباحث سے بھرپور کتاب۔ نیا اڈیشن جدید اضافے کے ساتھ قیمت -/۱۰ روپے

جامع الشواہد

از:- امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ

کیا غیر مسلم حضرات مسجدوں میں داخل ہو سکتے ہیں؟

مولانا آزاد کی لکھی ہوئی ایک مفید معلوماتی کتاب جو بڑے عرصے سے تعلق رکھتی ہے

قیمت:- ۸/- روپے

عیدین

از:- امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ

عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے دو مختصر لیکن جامع خطبات

مولانا ابوالکلام آزادؒ کے زور قلم ایک شاہکار جو عرصے سے نایاب تھا۔ اب شائع ہو گیا ہے۔ قیمت ۸/- روپے

ہجر و وصال

از:- امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ

"البلاغ" کے وہ مضامین جن کی آج پھر شدید ضرورت ہے۔ عرصے سے نایاب کتاب دوبارہ شائع ہو گئی ہے۔ قیمت ۱۶/- روپے

مقالات ابوالکلام آزادؒ

مولانا آزادؒ نے مسلمانوں کی جو علمی سیاسی اور مذہبی خدمات انجام دی ہیں محتاج بیان نہیں۔ مولانا ان لوگوں میں سے تھے۔ آج جو مرنے کے بعد بھی ہمیشہ زندہ رہتے ہیں آپ کے زور نگار قلم سے نکلے ہوئے چند شہ پارے "مقالات ابوالکلام آزادؒ" ہر بالغ نظر کے لئے ایک ضروری و مفید کتاب

قیمت -/۱۰ روپے

ہماری مطبوعات

ادبی کتب

ڈرامہ نگاری کا فن	پروفیسر محمد اسلم قریشی	35/-
اقبال کا فلسفۂ خودی	پروفیسر محمد عثمان	30/-
ترقی پسند ادب	عزیز احمد	15/-
مقاماتِ اقبال	ڈاکٹر سید عبداللہ	20/-
سرسید احمد خاں اور نامور رفقاء	"	25/-
عرفانِ اقبال	بشیر مخفی	20/-
بچوں کی تربیت	ڈاکٹر عبدالروف	10/-
ذکرِ اقبال	عبدالمجید سالک	20/-
اوصافِ اقبال	بہار الہ آبادی	50/-
اردو کیسے پڑھائیں؟	مولوی سلیم عبداللہ	12/-
نادراتِ مرزا	سید صفدر حسین	10/-
انتخابِ معانی	اسلم رفیق	6/-

شعر و شاعری

صد برگ	پروین شاکر	25/-
مرے دل مرے مسافر	فیض احمد فیض	15/-

تنقیدی کتب

اشاراتِ تنقید	ڈاکٹر سید عبداللہ	25/-
اردو تنقید کا ارتقاء	ڈاکٹر عبادت بریلوی	35/-
اردو تنقید نگاری	"	20/-

مذہبی کتب

عیدین	مولانا ابوالکلام آزاد	7/-
ولادتِ نبویؐ	مولانا ابوالکلام آزاد	10/-
فلسفہ	"	10/-
جامع الشواہد	"	5/-
انسان کی حیاتِ صالحہ	"	15/-
ہجر و وصال	"	15/-
انسانیت موت کے دروازے پر	"	7/50
مقالاتِ آزاد	"	10/-
حضرت یوسف علیہ السلام	"	10/-

طنز و مزاح

نوابِ فراڈ جنگ بہادر	ابراہیم جلیس	

ناول

خوشبو	مینا ناز	20/-
ابرِ بہاراں	زبیدہ سلطانہ	22/50
سدرہ	"	25/-
سونا سونا آنگن	سیدہ ماجدہ خاتون	25/-
آہٹ	"	36/-
بتِ ارمنی	مس ناز کفیل گیلانی	26/-
تجھ بن جیا کیا کیا	ممتاز انجم	16/-
دامانِ ساحل	عظمت اقبال شمع	25/-
آنگن کا چاند	رضیہ جمیل	37/-
ذوبا	ڈاکٹر شاہین حق	26/-
بندگی	پروین شریف	22/-

شاہین بک سینٹر

سرورق ٹائٹل باہتمام جلال پریس، مٹیا محل، دہلی طبع شد